ماہ نامہ

اردو دنیا

قومی اردو کونسل کا معتبر علمی جریدہ

''فکر و تحقیق''

جو ہر سہ ماہی پر دعوت فکر دینے والے تحقیقی مواد کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے

جس میں شائع ہونے والے مضامین کا خاصہ ہے معلوم حقائق کی چھان بین اور نامعلوم حقائق کی دریافت

صرف ایک جریدہ نہیں، ماضی کے اندوختوں اور حال کے

اکتسابات سے مستقبل کو مالا مال بنانے کی ایک تحریک

آئندہ شمارہ مخدوم محی الدین نمبر ہوگا

خود بھی اس رسالے کے خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی اس کی خریداری کا مشورہ دیں۔

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ 25 روپے

سالانہ قیمت بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

دہلی سے باہر کے خریدار صرف ڈرافٹ یا منی آرڈر ہی ارسال کریں۔

غیر ملکی خریداروں کے لیے

ممالک	سادہ ڈاک آرڈینری	سادہ ڈاک رجسٹرڈ	ہوائی ڈاک آرڈینری	ہوائی ڈاک رجسٹرڈ
پاکستان	172 روپے	184 روپے	256 روپے	316 روپے
نیپال	160 روپے	228 روپے	292 روپے	360 روپے
بنگلہ دیش	146 روپے	174 روپے	238 روپے	306 روپے
دیگر ممالک	160 روپے	220 روپے	336 روپے	396 روپے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک: 8، وِنگ: 7، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 110066

ماہ نامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد-10، شمارہ-4، اپریل 2008

مدیر: ڈاکٹر علی جاوید

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا،
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6
آر. کے. پورم، نئی دہلی- 066 110
فون: 26103938, 26103381
فیکس: 26179657 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urduduniyancpul@yahoo.co.in
urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746, 26169416

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجدیار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040 - 24415194

اس شمارے میں

آپ کی بات ..... قارئین کے خطوط 2
کونسل کے نئے وائس چیئرمین (تعارف) ..... ادارہ 6
ہماری بات ..... ادارہ 7

زبان و ادب اور تعلیم

● پریم چند کی ایک نایاب گم شدہ کہانی "آسمان کی پری" ..... پردیپ جین 8
● برصغیر میں اردو فاصلاتی تعلیم کا دائرۂ کار ..... ریاض احمد 13
● اردو کی کہانی— کل اور آج ..... اظہار اثر 16
● کرناٹک میں اردو نظم ..... رفعت النسا بیگم 18

شخصیات

● علامہ دتاتریہ کیفی دہلوی ..... گلزار دہلوی 23
● پروفیسر محمد شفیع— ایک معروف و ممتاز جغرافیہ داں ..... محمد خلیل 25

صحت اور ماحولیات

● ایڈز کا عارضہ اور ہماری ذمے داریاں ..... شمیم احمد صدیقی 27
● ہماری قوت مدافعت ہی ہمیں صحت مند رکھتی ہے ..... جگدیش پرشاد ورما 30
● پراسرار بادل ..... آر. رام چندرن 31

روبرو

● پروفیسر بصیر احمد خاں سے گفتگو ..... محمد نثار 34

کیریئر

● امتحان کی تیاری کیسے کریں ..... کاشف غزالی 36
● دسویں کے بعد کیا کریں ..... فاروق احمد 39

ہماری مطبوعات سے

● ہمت اور بزدلی ..... دھیریندر سنگھ جفا 43
● کرم شکم ..... خورشید احمد شفقت اعظمی 49

اردو خبرنامہ ..... ادارہ 52

تبصرہ و تعارف

● تاریخ تمدن ہند ..... ظفر احمد نظامی 71
● انیس کے سلام ..... احمد کفیل .....
● نئی شعری روایت ..... شعیب رضا فاطمی .....
● خوش کلامیاں قلم کاروں کی ..... رفیع جعفر .....
● مجتبیٰ حسین: بحیثیت طنز نگار ..... وسیم احمد .....
● ترکش ..... سرفراز جاوید .....

بچوں کا گوشہ

● ایک عجیب و غریب تحفہ ..... شرجیل احمد خاں 78
● سانپوں کی دنیا ..... خسرو متین 79

آپ کی بات

■ شمس رحمی، C-166، ویکم سلیم پور III، دہلی-110053

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی اہمیت و افادیت کا اندازہ ماہ نامہ ''اردو دنیا'' اور سہ ماہی'' فکر و تحقیق'' سے ہو جاتا ہے۔ دعا گو ہوں کہ رسالے کی صحتِ متن خوب سے خوب تر کی جانب گامزن ہو۔ عام طور پر سرکاری اداروں سے نکلنے والے جریدے مقبول خاص و عام نہیں ہو پاتے لیکن ان دونوں رسائل کو پڑھ کر بے انتہا طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ میں اردو کا ایک شاعر ہوں اور یہ زبان میری شناخت کا وسیلہ ہے لہٰذا یہ اعتراف میرا فرض ہے۔ ان دنوں آپ نے اپنے اداریوں کے ذریعے اصلاح زبان کی مہم چھیڑ رکھی ہے اس سلسلے میں محترم شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا مستقل کالم ''اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف'' سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے ساتھ ہی اداریے میں آپ جس طرح اردو زبان میں در آنے والی غلطیوں کا ذکر کرتے ہیں وہ قابلِ غور بھی ہے اور اس کے تدارک کا جلد از جلد وسیلہ ڈھونڈنا تاریخی اقدام بھی ہوگا۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ زبانیں جب جغرافیائی لحاظ سے پھیلتی ہیں تو علاقائی اثرات ان میں در آتے ہیں لیکن باوجود اس کے ہر زبان کی کچھ بنیادی خصوصیات ہوتی ہیں اور اردو زبان کی بنیادی خصوصیت یا اس کی شیرینی کا راز اس کی تراشیدہ اصطلاحات اور تلفظات میں پوشیدہ ہے، لیکن یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ آج اردو برادری زبان کے اس جوہر کو لقمے اور پنتے ہوئے خاموشی سے دیکھ رہی ہے۔ یقیناً یہ ایک ایسا اہم موضوع ہے جس پر سیمینار ہونے چاہئیں، سمپوزیم ہونے چاہئیں اور ایک تحریک کی صورت میں اردو زبان کی حرمت کے لیے ہر صاحب نظر اردو داں حضرات کو آواز بلند کرنی چاہیے۔ عملی اقدام کی صورت میں پبلی کیشن، اداروں، اخبارات و رسائل کے مالکان، سرکاری و نیم سرکاری اردو اداروں نیز اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں کے صدور سے بالشافہ گفتگو بطور وفد بھی کی جانی چاہیے۔ آپ نے عملی اقدام کی شروعات اپنے ادارے سے کر دیا ہے اللہ کرے آپ کی یہ کوشش کارگر ثابت ہو۔

■ محمد اسحاق، جاوید منزل، ہاؤس نمبر 11-4-614/6، بازار گرڈ، حیدرآباد-500004

''اردو دنیا'' مارچ 2008 سامنے ہے۔ خواجہ غلام السیدین کا ایک مضمون ''قوموں کی تقدیر'' خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہے۔ وہ ماہر تعلیم اور ماہر سماجیات تھے۔ اس عنوان کے آخر میں علامہ اقبال کا ایک شعر نوٹ کیا گیا ہے (46-49)

آ تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

اس شعر کی تشریح میں وہ لکھتے ہیں: ''اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی قوم کے اقبال کا آغاز جد و جہد اور سعی و طلب سے ہوتا ہے اور اس کا انجام عیش و عشرت پر'' ایک فارسی شعر کی تشریح میں لکھتے ہیں: ''یعنی اگر دولت اور ملک گیری کی ہوس میں تلوار اٹھائی جائے تو انشاء اللہ وہ تلوار ان کے سینے میں اتر جائے گی اور شاید اس سے کہیں بہتر ہوگا کہ قوم طاؤس و رباب کے بے کار شغل میں الجھی رہے۔'' یہاں انشاء اللہ کا استعمال بہت ہی نامناسب ہے اور تشریح بالکل ہی بے معنی ہے۔

اس سلسلے میں یہ عرض کرنا ہے کہ کوئی پانچ چھ سال قبل مجھے محفل اقبال (مسجد گن فاؤنڈری) حیدرآباد میں ایک مضمون ''تقدیر امم کیا ہے'' پڑھنے کا موقع ملا۔ یہی مضمون کوئی پانچ سال قبل علی گڑھ یونیورسٹی کے ماہنامہ ''تہذیب الاخلاق'' میں شائع ہوا تھا۔ یہی مضمون میری دوسری تصنیف ''تعلیم ایک تحریک اور متفرق مضامین'' (2003) میں شائع ہوا ہے۔

اقبالیات کے لٹریچر میں اس شعر کی تشریح پر باوجود تلاش کے کوئی مواد نہ مل سکا۔ اس مضمون میں، میں نے اپنی فہم و دانست کے مطابق آیت قرآنی کی روشنی اور تاریخ اسلام کے پس منظر میں تشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس شعر کے دوسرے مصرع کو میں نے یوں تبدیل کیا ہے:

آ تجھ کو بتاتا ہوں، تقدیر امم کیا ہے
علم و عمل اول، تعمیر حیات آخر
(ہوتا تو بہتر تھا)

باقی مضمون اسی دوسرے مصرعے کی تائید میں ہے۔ اقبالیات کے لٹریچر میں اس شعر پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی ہے۔ تاریخ اسلام اور ہندوستان کی تاریخ شاہد ہے کہ ''طاؤس و رباب'' یعنی عیش و عشرت مسلمانوں کی حکومتوں کے زوال کا ایک اہم سبب رہا ہے۔ اس تاریخی پس منظر میں اقبال، کا عیش و عشرت کی طرف اشارہ بھی نامناسب ہے۔

ماہرین اقبالیات کے لیے بھی اس شعر کی معنویت اور نتائج پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

■ **ڈاکٹر اشفاق محمد خاں، B-1066، اندرا نگر، لکھنؤ (یوپی)**

آپ نے مخدوم محی الدین پر سہ روزہ سیمینار کر کے سنجیدہ، مخلص، ایماندار اور انسان دوست ترقی پسند احباب پر بڑا احسان کیا ہے۔

اچانک اردو دنیا کے مطالعے سے مخدوم پر سیمینار کی رپورٹ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ آپ کا یہ سیمینار کارخیر بھی ہے اور کارنامہ بھی۔ میری خواہش ہے کہ آپ کو اس سے زیادہ کچھ سوچنے، سمجھنے اور کچھ کر گزرنے کی صلاحیت نصیب ہو۔

مجھے 60-1950 کے درمیان کی ایک نہایت مختصر شعری نشست زندگی بھر یاد رہے گی جب میں نے اور تاباں صاحب مرحوم نے اس میں شرکت کر کے خود مخدوم سے ان کی چار نظمیں ترنم سے سنی تھیں۔ ان میں ایک نظم ''قید'' بھی تھی جس کی دھن مجھے آج تک یاد ہے اور میں نے برسوں اس نظم کو مخدوم کی ہی لے اور دھن سے احباب کو، خوش کیا۔

■ **صوبیدار ایم اے خاں، 15 راجپوت، معرفت 56، اے پی او**

فروری کا ''اردو دنیا'' موصول ہوا جسے ایک ہی نشست میں پڑھ گیا۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے ''ابھی اردو روزمرہ محاورہ، صرف'' بے حد مفید کالم شروع کیا ہے جسے پڑھ کر مجھ جیسے ہزاروں لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اپنے علم میں اضافہ بھی کر رہے ہیں لیکن کچھ لوگ فضول سوال کر کے نہ صرف فاروقی صاحب کا وقت برباد کرتے ہیں بلکہ ''اردو دنیا'' کے قیمتی صفحات کا بھی نقصان کرتے ہیں جیسا کہ اس شمارے میں بھی ہوا ہے۔ بار بار کی گزارش بھی بیکار جا رہی ہے۔ کاش کہ لوگ اس طرف بھی توجہ دیں اور اپنا اور فاروقی صاحب کا وقت برباد نہ کریں۔ یہی میری مودبانہ گزارش ہے۔

■ **قاضی محمد ایوب، محلہ سوداگران، جودھپور-342001 (راجستھان)**

صدآفریں، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید اور ان کے رفقائے کار کو، کہ گوہاٹی میں جنگل میں منگل کر دیا۔

جناب شمیم رضا فاطمی نے میلے کا نقشہ ایسا تحریر فرمایا کہ ہم دور بیٹھے قارئین کو میلے میں شمولیت کا خوشگوار احساس ہوا اور خیال پیدا ہوا کہ کاش! ایسا ادبی میلہ ہمارے شہر میں بھی ہو۔

واقعی بقول شمیم صاحب ''میلہ ہمارے معاشرے میں ایک ایسا لفظ ہے جو اپنے آپ میں جمہوریت اور سیکولرزم کا سمبل بن گیا ہے۔''

کتابوں کی نمائش کے ساتھ ساتھ مختلف ڈراموں نے بھی جلسے کو دلچسپ، پراثر، پربہار اور پروقار بنا دیا۔ میلے کے متعلق انگریزی ہفتہ وار ریڈینس (2-8 March) میں بھی ڈاکٹر سعید احمد کا تحریر کردہ مضمون بعنوان (Urdu Mela - Organised at Guwahati) پڑھنے کا موقع ملا۔ گوہاٹی اردو میلے کی کامیابی پر شمیم رضا فاطمی اور تمام اراکین کو مبارک باد۔

■ **ڈاکٹر شبانہ آفرین جاوید، H-17، علی اپارٹمنٹ، سیکنڈ فلور، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025**

''اردو دنیا'' ہماری زبان ہی کا نہیں بلکہ ملک کی اقلیت کی خوشحالی یا بدحالی کا آئینہ دار ہے۔ یہ اردو کا واحد رسالہ ہے جس سے اردو زبان کے نشیب و فراز کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کسی بھی زبان کی رفتار و ترقی جاننے کے لیے اس کے رسائل معاون ثابت ہوتے ہیں۔ یوں تو ہر ماہ ''اردو دنیا'' کے مضامین سے میں بے حد متاثر ہوا کرتی ہوں لیکن مارچ 2008 کے شمارے میں شامل دو مضامین نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے اور میں یہ خط لکھنے پر مجبور ہوئی ہوں۔ پہلے میں جناب نصیر احمد خاں کے مضمون بہ عنوان ''ایم۔اے اردو ادب کا نصاب'' کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرنا چاہوں گی۔ یہ مضمون شروع سے آخر تک معلوماتی اور فکر انگیز ہے۔ نصاب میں کون سے اضافے یا تبدیلی سے طالب علم کا علمی و مادی فائدہ ہوگا انھوں نے اس امر پر روشنی ڈالی ہے۔ اردو زبان ضروریات زندگی کے پورا کرنے میں کس طرح معاون ثابت ہوگی، اس کی نشاندہی کی ہے۔ اردو کی ڈگریاں کس طرح Job Oriented بن سکتی ہیں اس کی بخوبی وضاحت کی ہے اور اردو سے مایوس دلوں کو امید کی کرن عطا کی ہے۔ ان کی پیش کردہ تجاویز کو UGC کو تسلیم کر لینا چاہیے اور جلد از جلد نافذ بھی کر دینا چاہیے۔ اس طرح اردو والوں کے لیے ''ہم ہوں گے کامیاب ایک دن'' کا Slogan بھی صادق ثابت ہو جائے گا۔

دوسرا مضمون جناب مشتاق احمد کا ''اردو — عالمی لسانی تناظر میں'' ہے۔ اسے میں نے بار بار پڑھا۔ ان کے مضمون سے یہ بات تو بالکل صاف ہے کہ مشتاق احمد کی نظر زبان اور اس کے مسائل پر بہت گہری ہے۔ اردو زبان کے ساتھ جو متعصبانہ رویہ روا رکھا گیا ہے اور اسے تعلیمی معیار کے جس خانے میں رکھا گیا ہے وہ سبھی جانتے ہیں۔ المیہ یہ بھی ہے کہ اس زبان کو اپنی زبان کہنے والوں نے بھی اس کے ساتھ کیسی دشمنی کی ہے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ اب سوال ہے کہ ہم اپنے کلچر اور اپنی زبان کی کس طرح حفاظت کریں اور کن تقاضوں کو سامنے رکھیں؟ یہ پوری بحث انھوں نے کی ہے۔ اکیسویں صدی سائنسی صدی ہے، اس کے حوالے سے اردو زبان کے طلبہ و طالبات کے سامنے دشواریاں اور Challenges بھی ہیں۔ ان کا زیادہ وقت زبان کو سمجھنے میں ختم ہو جاتا ہے اور جب عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو دیگر طاقتور زبانوں سے جنگ کرنی پڑتی ہے۔ طاقتور زبانوں کے قدم سے

قدم ملا کر چلنے سے ہی اس زبان کو مستحکم بنایا جاسکتا ہے۔ اس طرح کے مضامین سے اردو قارئین یقیناً فیض یاب ہوں گے اور اردو سے محبت رکھنے والوں کو صحیح نہج نصیب ہو پائے گی۔ دونوں مضامین قابلِ تحسین ہیں اور ان کی اشاعت پر ادارے کو میں مبارک باد پیش کرتی ہوں۔

■ محمد ناظم علی، صدر شعبۂ اردو، گری راج کالج، نظام آباد-503002

فروری 2008 کا اردو دنیا بروقت دست ہوا۔ یہ رسالہ اپنے مشمولات کی وجہ سے منفرد محسوس ہوتا ہے۔ اس کے مدیر ڈاکٹر علی جاوید اور اعزازی مدیر مخمور سعیدی کی کاوشوں سے اس کی جامعیت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ آج کے ماحول میں صرف ادب سے پیاس نہیں بجھتی بلکہ قارئین مختلف علوم و فنون کی بصیرت حاصل کرنا چاہتے ہیں جو یہ رسالہ فراہم کررہا ہے۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا مستقل کالم "اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف" بہت مفید اور معلومات افزا ہے۔ اس کالم سے نہ صرف طلبہ بلکہ مشاہیر ادب بھی فیض اٹھاتے ہیں۔ اردو خبرنامے سے ملک اور بیرون ملک اردو کی سرگرمیوں سے واقفیت ہوتی ہے اور اس زبان کی اہمیت اور عظمت واضح ہوجاتی ہے۔ تبصرہ و تعارف کا کالم ادبی شعور عطا کرنے والا ہے۔ اس رسالے کے ذریعے سے اردو کے لیے جو تحریک اور جذبہ مل رہا ہے اسے زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی ضرورت ہے۔

■ محمد طیب وحید الزماں، روم نمبر-35، شعبۂ اردو، رانچی یونیورسٹی، (جھارکھنڈ)

ہر ماہ "اردو دنیا" زیرِ مطالعہ رہتا ہے۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے کالم "اچھی اردو: روزمرہ محاورہ صرف" سے گرانقدر فائدہ پہنچ رہا ہے۔ یہ مضمون وقت کی اہم ضرورت ہے۔ دل سے دعا ہے کہ "اردو دنیا" مزید مقبولیت حاصل کرے اور اس سے خواص و عوام یکساں فائدہ اٹھائیں۔

■ ڈاکٹر جگدمبا دوبے، شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

فروری 2008 کا ماہنامہ "اردو دنیا" نظر نواز ہوا۔ محمد حسن صاحب کا مضمون "اردو نصاب" اور عبدالستار دلوی کا مضمون "مہاتما گاندھی کا اردو سے لگاؤ" بے حد پسند آئے۔ "تقابلی مطالعہ اور طریقۂ کار" میں شاہد پرویز صاحب نے تقابلی مطالعے پر اچھی روشنی ڈالی ہے۔ رعنا سید کا مضمون "غالب: فکر، فلسفہ، فن" بھی بے حد اچھا ہے۔ اس میں غالب کے فکر، فلسفہ اور فن کو ایک ساتھ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اب کی بار کا اردو خبرنامہ بے حد طویل ہے۔ شمارے کے آخر میں انور ادیب کا مضمون "جاپانی انجینئروں کے حیرت انگیز کارنامے" مختصر تو ہے لیکن اچھا ہے۔ اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے آپ لوگوں کی محنت قابلِ تعریف ہے۔ کونسل کی ترقی کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ۔

■ افضل بیگ، مسلم لائبریری، نمبر-8، ویرو پلے، اسٹریٹ، بنگلور

ماہنامہ "اردو دنیا" ماہ جنوری 2008 میں مضمون بعنوان "سائنس کی ترقی اور مائیکروچپس" پڑھا۔ بہت مفید معلومات حاصل ہوئیں۔ تحریر بہت جاندار اور مفید ہے۔ ہم "اردو دنیا" سال کے آخر میں ترتیب دے کر مجلد کرا لیتے ہیں۔ اس طرح یہ گراں قدر مضمون ہمارے ریکارڈ میں داخل ہوکر بہت سارے قارئین کو فائدہ پہنچائے گا۔ مضمون نگار اقبال محی الدین کو ایسا مضمون لکھنے اور شائع کروانے پر مبارکباد۔

■ ڈاکٹر جبار راجن پردیسی، ایڈیٹر "دھنک" میگزین "امن" گاندھی اسٹریٹ، اترولی-202280، (علی گڑھ) یوپی

"اردو دنیا" کے مضامین پر تبصرہ کرنا عالم و فاضل دانشوروں کا کام ہے۔ میں تو طفلِ مکتب ہوں۔ "اردو دنیا" اور آپ کا مداح ہوں۔ اس ویران مقام پر اردو کی آبیاری کے لیے میں ہی تنہا کوشاں ہوں۔ اردو کو مسلمانوں کی زبان کہہ دینا کتنا مضحکہ خیز ہے۔ اگر اردو میں شیرینی اور تہذیب نہ ہوتی تو شاید اسے کوئی پسند نہ کرتا خواہ وہ کسی مذہب یا دھرم کا ہو۔ میرے کرم فرما آنجہانی مہو ارام گپتا صاحب مجاہد آزادی تھے۔ انھوں نے اردو میں کئی کتابیں لکھیں۔ بالخصوص مجاہدین جنگ آزادی کے لیے۔ "امر شہیدوں کی تجی کتابیں"، "شہید اعظم اشفاق اللہ" میں نے اور انھوں نے مشترکہ طور پر لکھی وہ ضلع فرخ آباد کے رہنے والے تھے اور کانپور میں زندگی گزاری۔ "بلیٹز" میں میرا کوئی مضمون پڑھنے کے بعد خط لکھا۔ پھر انھوں نے مجھے بھی اپنا تیسرا بیٹا بنالیا۔ پندرہ پندرہ دن غریب خانے پر تشریف رکھ کر روحانی جسمانی سکون محسوس کرتے تھے یہاں تک کہ مرتے وقت مجھے بلایا اور میرے ہاتھوں میں ہی دم دیا۔

■ قیوم ناتک، سرسید مسلم ایجوکیشنل انسٹی ٹیوٹ/ٹرسٹ، بھروٹ راجوری، جموں و کشمیر

ماہنامہ "اردو دنیا" مسلسل مل رہا ہے۔ رسالہ بڑا معیاری اور قابلِ تعریف ہے۔ جو اردو زبان و ادب کی خدمت کررہا ہے۔ طلبہ کے لیے خصوصی طور پر نت نئے مضامین اور ہندوستان بھر کی اردو زبان کی خبریں اور مسائل صرف اسی رسالے میں ملتے ہیں یہ اردو زبان و ادب پر اپنے نقوش چھوڑ رہا ہے جس کے لیے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

■ ڈاکٹر عبید اقبال عاصم، 4/460، زہرہ باغ، سول لائنز، علی گڑھ-202001 (یوپی)

فروری 2008 کا ماہنامہ "اردو دنیا" نظر نواز ہوا۔ بیش قیمت مضامین،

زبان و تعلیم سے متعلق عمدہ مقالات، معلوماتی فیچرز نہایت کارآمد و مفید ہیں۔ محترم شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا مستقل کالم ''اچھی اردو'' ان سب پر مستزاد۔

بہرحال اردو دنیا کو آپ کی طرف سے جو قیمتی سوغات مل رہی ہے اس کے لیے آپ اور ادارہ ''اردو دنیا'' بہرطور قابل مبارکباد ہے۔

■ قمر رضا نقوی، ایڈیٹر ''بازگشت'' امروہہ، یوپی

ماہنامہ ''اردو دنیا'' کا فروری 2008 کا شمارہ پامصرہ نواز ہوا۔ اس شمارے میں ''مہاتما گاندھی کا اردو سے لگاؤ''، ''درسی کتابوں میں املا کے مسائل''، ''عالمی وراثتیں لال قلعہ اور رگ وید'' نہایت معلوماتی مضامین ہیں۔ ''اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف'' ادبی معلومات کا خزانہ لٹانے کے مترادف ہے۔ امید کہ اس سلسلے کو قائم رکھ کر صحیح ادبی ذوق رکھنے والوں کی تسکین کا سامان فراہم کرتے رہیں گے اور تشنگان علم و ادب لفظوں اور محاوروں کے صحیح مفاہیم و مطالب سے بہرہ ور ہوسکیں گے۔

آپ نے اپنے اداریے ''ہماری بات'' میں اردو اخبارات و رسائل کے تعلق سے جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ یقیناً صحافتی اداروں کے لیے قابل توجہ ہیں۔ اس طرح کی غلطیوں کی اصل وجہ ہر چیز کا کمرشیل ہوجانا ہے اور تجارت میں مال کے معیار کو نہیں بلکہ کم قیمت کو ترجیح دی جانے لگی ہے اسی طرح ادب و زبان میں بھی کم علم لوگوں کا بول بالا ہوتا جارہا ہے۔ صلاحیتوں کی ناقدری اور ادبی و علمی قدروں کے اس انحطاطی دور میں ''اردو دنیا'' جیسا جریدہ اس کا ثبوت ہے کہ اردو ادب ابھی تاریکیوں کے حوالے نہیں ہوا ہے۔

□□□

فورٹ ولیم کالج کے نسخۂ کلیات میر (مطبوعہ 1811) کے بعد کلام میر کا صحیح ترین اور مکمل ترین نسخہ

کلیات میر (دو جلدوں میں)

جلد اول (مکمل چھ دیوان غزلیات) صفحات: 870 ● قیمت 402 روپے مجلد، 336 روپے غیر مجلد ● سائز: 20X26X8

مرتب: غلام عباس عباسی ● بہ تصحیح و اضافہ: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

جلد دوم (قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ) صفحات: 632 ● قیمت 430 روپے مجلد، 410 روپے غیر مجلد

تحقیق و ترتیب: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

- اس نسخے کو تمام اہم اور قابل ذکر مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے اور بقدر ضرورت قلمی نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔
- کلام میر میں مستعمل بے شمار نادر اور نامانوس الفاظ کی صحت و درستی کو بڑی حد تک یقینی بنایا گیا ہے۔
- نسخۂ عباسی جو صرف غزلیات پر مشتمل تھا اس میں نسخۂ محمود آباد سے بہت سارا کلام لے کر اضافہ کیا گیا ہے۔ اس طرح اب جلد اول میں غزلیات کی کل تعداد 1916 ہے جو ابھی تک کے تمام مطبوعہ نسخوں سے زیادہ ہے۔ غزلیات میں اشعار کی کل تعداد 13908 ہے۔
- جلد دوم میں میر کے تمام مرثیوں کو پہلی بار پوری صحت کے ساتھ مکمل صورت میں سامنے لایا گیا ہے۔
- جلد دوم میں منظومات کو پہلی بار بالکل نئی، مناسب اور بااصول ترتیب سے رکھا گیا ہے۔ اس طرح نسخے میں شامل کسی بھی منظومے کو تلاش کرلینا آسان ہوگیا ہے۔
- دونوں جلدوں میں متن کی تصحیح کے دوران مختلف مستند اور بعض نادر لغات اور فرہنگوں کا سہارا لیا گیا ہے۔
- جلد دوم میں دو تفصیلی دیباچے شامل ہیں۔ احمد محفوظ کے دیباچے میں کلام میر کی تدوین و تصحیح متن سے متعلق نہایت اہم امور زیر بحث لائے گئے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے دیباچے میں مثنویات میر اور میر کے عمومی کلام پر ایک بالکل نئے پہلو سے گفتگو کی گئی ہے۔
- جلد اول میں دیگر مضامین کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی کا دیباچہ نما ایک نیا مضمون ''تمہید'' کے عنوان سے شامل ہے۔
- ان دونوں جلدوں کو بڑے سائز پر سفید کاغذ اور عمدہ کمپوزنگ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے اور سرورق ایسا ہے جو میر کے زمانے کی تہذیبی و ثقافتی روایت کی عکاسی کرتا ہے۔

کلیات میر (جلد اول و دوم) ملک کے تمام بڑے کتب فروشوں کے یہاں دستیاب ہے۔ اردو کونسل سے براہ راست بھی طلب کی جاسکتی ہے۔

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

قومی اردو کونسل کے نئے وائس چیئرمین، چندر بھان خیال

مختصر تعارف

جدید لب و لہجے کے منفرد اور ممتاز شاعر چندر بھان خیال ایک بے خوف اور ایماندار صحافی کی حیثیت سے بھی اردو دنیا میں اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔ وہ اردو روزنامہ ''قومی آواز'' نئی دہلی میں 25 برس صحافتی خدمات انجام دینے کے بعد حال ہی میں ریٹائر ہوئے ہیں۔ اس سے قبل وہ کئی برس اردو روزنامہ ''سویرا'' نئی دہلی اور روزنامہ ''تیج'' نئی دہلی میں سب ایڈیٹر رہے۔ چندر بھان خیال جب 1967 میں تلاشِ معاش میں دلی آئے تو پھر اسی شہر کے ہو کر رہ گئے۔ چندر بھان خیال 1988 میں دوسری عالمی اردو کانفرنس، نئی دہلی کے اعزازی سکریٹری اور دو مرتبہ دلی اردو اکادمی کی گورننگ کونسل کے ممبر رہے۔ وہ راجدھانی کی کئی ادبی و ثقافتی انجمنوں کے سرگرم کارکن ہیں۔ کئی انعامات و اعزازات سے نوازے جا چکے ہیں۔

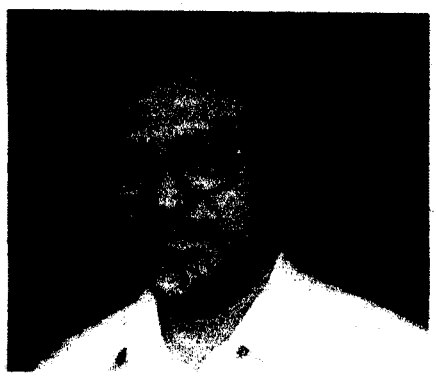

1979 میں چندر بھان خیال کا پہلا مجموعۂ کلام ''شعلوں کا شجر'' منظر عام پر آیا تو ان کے تیکھے تیور، نئی سوچ اور انوکھے انداز فکر و بیان نے سبھی کو چونکا دیا۔ ان کی ایک طویل نظم ''ہاں! وے مسلمان ہیں'' جو ایک ہندی نظم ''وے مسلمان ہیں'' کے ردعمل میں لکھی گئی ہے، اردو عوام میں زبردست مقبولیت کی حامل ہے۔ 2002 میں خیال کی معرکہ آرا طویل نظم ''لولاک'' کتابی شکل میں شائع ہوئی جو رسول اللہ حضرت محمد ﷺ کی سیرت مبارک اور آپ کی زندگی کے اہم واقعات کے بیان پر مبنی ہے۔ ''لولاک'' کو اردو کے دانشوروں، مفکروں اور تنقید نگاروں نے ایک کارنامہ قرار دیا ہے۔ یہ نظم بے حد مقبول ہوئی۔ ''لولاک'' پر اظہار رائے کرتے ہوئے جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا ہے کہ ''یہ سیرت کی کتاب بھی ہے، نعت بھی ہے اور تاریخ انسانی کا سنہرا ورق بھی۔ خیال کی قادرالکلامی کتاب کے ہر صفحے پر ظاہر ہے۔ فنی طور پر اس نظم کا عقل کو حیران کر دینے والا پہلو اس کے قافیوں کی ترتیب ہے۔ ایسی مشکل ترتیب کو ایجاد کرنا ہی کیا کم مشکل کام تھا کہ شاعر نے اسے نہایت چابک دستی سے نبھا کر میرا تو دل ہی موہ لیا ہے۔'' خیال 1970 کے بعد ابھرنے والے شعرا میں بہت نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

چندر بھان خیال کی دیگر تصانیف میں مجموعۂ کلام ''گمشدہ آدمی کا انتظار'' مجموعۂ کلام ''صبح مشرق کی اذاں''، ''سلگتی سوچ کے سائے'' (ہندی) اور ''کمار پاشی— شاعری اور شخصیت'' شامل ہیں۔

خیال کی ولادت 3 اپریل 1946 کو مدھیہ پردیش کے قصبہ بابئی (Babai) ضلع ہوشنگ آباد میں ہوئی۔ یہ خالص ہندی علاقہ ہے جہاں آج بھی اردو کا کوئی مدرسہ تک نہیں۔ خیال کے خاندان میں بھی ان سے پہلے کوئی اردو داں نہیں ہوا۔ اردو زبان سے ان کی محبت وہبی ہے۔ انھوں نے بڑی محنت اور لگن کے ساتھ اردو سیکھی اور خود ہی وہ استعداد پیدا کی کہ چند برسوں میں اردو کے ادبی منظرنامے پر شان کے ساتھ ابھرے اور دیکھتے ہی دیکھتے اہلِ زبان سے اپنے ادبی وجود کو تسلیم کرا لیا۔ خیال کی مادری زبان ہندی ہے لیکن وہ گذشتہ 40 برسوں سے لگاتار اردو کی خدمت میں منہمک ہیں۔

□□□

ہماری بات

ہندوستان کا آئین ہندوستان کے ہر شہری کو، خواہ اس کی قومیت، اس کی زبان، اس کا ثقافتی پس منظر اور اس کا مذہب و مسلک کچھ بھی ہو، یہ اختیار تفویض کرتا ہے کہ وہ ہندوستان بھر میں کہیں کی بھی سکونت اختیار کرسکتا ہے۔ جہاں چاہے وہاں رہ کر اسے اپنے لیے وسائل معاش حاصل کرنے کا بھی حق ہے، خواہ وہ ملازمت کی شکل میں ہوں یا کاروبار کی صورت میں۔ اپنے اس آئینی حق کا ہندوستانی شہری استعمال بھی کرتے رہے ہیں اور اس سے نہ صرف اس قومی وحدت کے تصور کو جس پر ہماری جمہوریت کی اساس ہے، فروغ حاصل ہوا ہے بلکہ ملک کی معیشت بھی مضبوط اور مستحکم ہوئی ہے۔ نقل مکانی کے عمل نے، خواہ اس کے اسباب کچھ بھی رہے ہوں، ملک کے مختلف علاقوں کو کئی اعتبار سے ثروت مند بنایا ہے۔ مختلف زبانیں بولنے والے اور الگ الگ ثقافتی اور تہذیبی پس منظر رکھنے والے ایک دوسرے کے قریب آئے ہیں اور انھیں ایک دوسرے کو سمجھنے کے بہترین مواقع حاصل ہوئے ہیں۔

ممبئی، جو مہاراشٹر کی راجدھانی ہے، اسے ہندوستان کی صنعتی اور کاروباری راجدھانی بھی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ وہاں بڑے بڑے کاروباری ادارے ہیں جن کا کاروبار دور دور تک پھیلا ہوا ہے، جس سے ہزاروں لوگ وابستہ ہیں۔ بڑی بڑی صنعتیں ہیں جن میں فلمی صنعت شاید سب سے بڑی ہے اور سب سے پرکشش بھی۔ یہ کشش ہندوستان بھر کے نوجوانوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور پھر وہ وہیں کے ہو رہتے ہیں اور اگر فلم میں نہیں تو کسی اور شعبے میں اپنے لیے وسیلۂ معاش پیدا کرلیتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ وہاں کی معیشت پر بوجھ نہیں بنتے بلکہ اپنی محنت اور صلاحیت سے اسے مزید بہتری کی طرف ہی لے جاتے ہیں۔

بدقسمتی سے پچھلے کچھ برسوں سے کچھ طاقتوں نے ممبئی کی پرامن فضا کو خراب کر رکھا ہے۔ جس شہر کی مسافر نوازی ضرب المثل کی طرح مشہور رہی ہے وہاں مذہبی تعصبات کو بھی ہوا دی جارہی ہے اور مہاراشٹرین اور غیر مہاراشٹرین کی نسلی تفریق پیدا کرکے ان لوگوں کو ممبئی چھوڑ دینے کے لیے کہا جارہا ہے جنھوں نے اس شہر کو بنانے سنوارنے میں اپنا خون جگر صرف کیا ہے۔ اس کے پیچھے جو عوامل کام کررہے ہیں انھیں سمجھنے کے لیے زیادہ غور وفکر کی ضرورت نہیں اس سارے شور وغوغا اور ہنگامہ آرائی کا مقصد اپنی سیاسی دکان چمکانا ہے۔

سیاست انسانی زندگی کی بہت اہم سرگرمی ہے جو زندگی کے تمام شعبوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ سیاست کے بغیر مہذب اور منضبط سماجی زندگی کا تصور ادھورا ہے مگر ادھر ہمارے بعض سیاست دانوں نے سیاست کو جو رنگ دے دیا ہے اور اسے سماجی خدمت کا وسیلہ سمجھنے کی بجائے جس طرح نجی مفادات کے حصول کا ذریعہ بنالیا ہے، وہ حد درجہ افسوسناک ہی نہیں، تشویشناک بھی ہے۔ ایسے خود غرض سیاست داں اپنے ادنیٰ مقاصد کی تکمیل کے لیے کبھی فرقہ وارانہ جذبات کا استحصال کرتے ہیں، کبھی زبان اور ثقافت کا سوال اٹھاتے ہیں تو کبھی علاقائیت کا راگ الاپتے ہیں۔ ان کے اس منفی طرز عمل سے ملک وقوم کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے اور جمہوری قدریں کس طرح پامال ہورہی ہیں، اس کی انھیں کوئی فکر نہیں۔

زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ ہماری بڑی سیاسی جماعتیں بھی جو ملک گیر حیثیت رکھتی ہیں، ان منفی میلانات پر روک لگانے میں زیادہ سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کررہی ہیں۔ اس کی دو ہی وجہیں ہوسکتی ہیں یا تو انھیں حقیقی صورت حال اور اس کے دور رس نتائج کا جو بہت خطرناک ہوسکتے ہیں، ادراک نہیں ہے یا پھر وہ اس خوف میں مبتلا ہیں کہ کہیں ایسا کرنے سے ان کا ووٹ بینک متاثر نہ ہوجائے۔ ہمارے خیال میں یہ اندیشہ بے بنیاد ہے۔ ہندوستانی عوام، خواہ وہ ملک کے کسی خطے سے تعلق رکھتے ہوں، آزادی کے گذشتہ ساٹھ برسوں میں سیاسی طور پر اتنے باشعور ضرور ہوچکے ہیں کہ مثبت اور منفی میلانات میں امتیاز کرسکیں اور اپنے ہی نہیں اپنے ملک کے نفع وضرر کو بھی سمجھ سکیں۔ ضرورت صحیح طور پر ان تک رسائی کی اور انھیں یہ باور کرانے کی ہے کہ وہ ساتھ دیں تو منفی طاقتوں کو زیر کیا جاسکتا ہے۔

ہنگامی اور وقتی سیاسی مصلحتیں اور ان کے تقاضے اپنی جگہ لیکن اگر ہمیں ملک کی سالمیت اور قومی یک جہتی عزیز ہے تو ان مصلحتوں سے اوپر اٹھ کر بھی کچھ کرنا پڑے گا۔ یہ عمل نیم دلی سے نہیں پورے خلوص نیت کے ساتھ ہو، یہ بھی ضروری ہے۔ نیم دلی سے جو کام انجام دیے جائیں اور جن میں خلوص نیت شامل نہ ہو، ان سے کبھی مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوتے۔

●

ہمیں افسوس ہے کہ اس بار جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا کالم "اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف" ہمیں بروقت موصول نہیں ہوا، اس لیے رسالے کے صفحات اس سے محروم رہے۔ فاروقی صاحب نے وعدہ فرمایا ہے کہ آئندہ سے وہ ناغہ نہ ہونے دیں گے۔ اس وعدے کے لیے ہم ان کے ممنون ہیں۔

□□□

پردیپ جین

پریم چند کی ایک نایاب گمشدہ کہانی
آسمان کی پری

منشی پریم چند کی رحلت کو 71 برس گزر جانے پر بھی محققین کی بے توجہی کے باعث ان کی متعدد تخلیقات پردۂ خفا کو چاک کرکے ادبیاتِ پریم چند میں اپنی واجب جگہ حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکیں۔ اردو میں 24 ضخیم جلدوں میں مدن گوپال کی مرتب کردہ ''کلیاتِ پریم چند'' اور ہندی میں 20 ضخیم جلدوں میں ایک ایڈیٹوریل بورڈ کی ادارت میں ''پریم چند رچناولی'' کی اشاعت کے ساتھ دونوں کلیات کے مدیران محترم نے دعوے کر دیئے کہ اب پریم چند کی کوئی چیز ان سے باہر ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ مگر یہ قابل حضرات یہ بھول گئے کہ ادبی تحقیق کے میدان میں حرفِ آخر کچھ نہیں ہوتا۔

اس دھول کی پول تب کھلی جب پریم چند ادبیات پر مزید تحقیق کے ابتدائی دور میں ہی راقم الحروف کو پریم چند کی ایک دو نہیں بلکہ نصف درجن نایاب و گمشدہ تخلیقات پرانے رسائل کے اوراق میں دستیاب ہوگئیں۔ قسمت کی خوبی کہ ماہنامہ ''آجکل'' نئی دہلی کے سابق ایڈیٹر ڈاکٹر ابرار رحمانی نے پریم چند کی ان نایاب تحریروں کو شائع کرنے کی پیش کش بلا تاخیر قبول کرلی۔ نتیجتاً ''آجکل'' کا اکتوبر 2006 کا شمارہ پریم چند نمبر نہ ہونے پر بھی پریم چند کی 70ویں برسی کے موقع پر شائع شدہ ایک خصوصی شمارے کی حیثیت رکھتا ہے جس میں علاوہ دیگر مضامین کے راقم الحروف کے مضمون ''پریم چند کی گمشدہ اور نایاب تخلیقات'' سے منسلک پریم چند کی نو تلاش کردہ تمام نایاب تحریریں بھی راقم کے حوالے سے شائع کردی گئیں۔

''آجکل'' کے اس خصوصی شمارے پر ادبا و قارئین کا ردِعمل ظاہر کرنے والے خطوط دسمبر 2006 کے شمارے میں شائع ہوئے۔ ان خطوط میں جہاں ایک طرف ''کلیاتِ پریم چند'' کے مرتب مدن گوپال اور ان کے قریبی دوست گوپال کرشن مانک ٹالہ نے تقریباً ملتا جلتا ردِعمل ظاہر کرتے ہوئے غیر متعلقہ حوالوں سے نکتہ چینی کی وہیں دوسری طرف ڈاکٹر قمر رئیس اور پروفیسر علی احمد فاطمی جیسے بلند پایہ نقادوں اور دیگر تمام حضرات نے پریم چند کی نایاب تحریریں پیش کرنے پر از حد خوشی کا اظہار کیا۔ ان خطوط میں پروفیسر علی احمد فاطمی کا خط بطور خاص اہم تھا کیونکہ انھوں نے پریم چند کے ایک ایسے افسانے ''آسمان کی پری'' کی اطلاع فراہم کی تھی جو نہ تو پریم چند کی کسی کتاب میں شامل ہے اور نہ ہی کسی بھی محقق نے اس کا حوالہ اپنے کسی مضمون یا کتاب میں پیش کیا ہے۔ پروفیسر فاطمی کا یہ خط ''آجکل'' کے دسمبر 2006 کے شمارے سے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

''ایک بار پھر پریم چند کی نادر تحریریں دیکھ کر حیرت ہوگئی کہ ابھی اور بھی کتنی چیزیں ہیں جو پردۂ خفا میں ہیں۔ ان سب تحریروں کو دیکھ کر مجھے بھی یاد آیا کہ جب میں آگرہ میں تھا تو اس وقت نظیر اکبرآبادی پر کام کرتے ہوئے کچھ پرانے کتب خانے دیکھے اور کچھ چیزیں تلاش کیں۔ اسی سلسلے میں، میں اخضر اکبرآبادی کے خاندان والوں سے بھی ملا۔ خادم حسین اخضر اور وحید حسین دو بھائی تھے۔ دونوں بھائیوں کا چمڑے اور جوتوں کا کاروبار تھا۔ اخضر شاعر تھے اور سیماب کے ہم عصر تھے۔ دونوں میں چشمک بھی رہتی تھی۔ خادم حسین اخضر نے ایک زنانہ لائبریری بھی قائم کر رکھی تھی۔ اس لائبریری کے زیرِ اہتمام سالانہ بڑی تقریب ہوتی جس میں عورتیں ہی شریک ہوتیں اور عورتوں کے مسائل پر ہی تحریر یا تخلیق پیش کی جاتی۔ اس محفل کی انفرادیت اور شہرت اس قدر بڑھی کہ اس میں حالی، شبلی، اکبر الٰہ آبادی، پریم چند وغیرہ بھی شریک ہوئے۔ حالی نے ''چپ کی داد''، ''مناجاتِ بیوہ'' اسی محفل کے لیے لکھیں اور پڑھیں۔ اسی طرح شبلی اور اکبر کی بعض چیزیں بھی۔ پریم چند نے ایک کہانی ''آسمان کی پری'' اسی محفل میں پڑھی اور پھر اسی لائبریری کے تحت کتابچے کی شکل میں شائع بھی ہوئی۔ تلاش میں مجھے ''چپ کی داد'' اور ''آسمان کی پری'' کے نسخے ملے۔ بعد میں میں نے دیکھا کہ پریم چند کی یہ کہانی ان کی کسی کتاب یا فہرست میں نہیں ہے۔ میں تحقیق کا آدمی نہیں ہوں اس لیے یہ میرے پاس پڑی رہ گئی۔ اب جب کہ میں نے ''آجکل'' میں ان کی نادر و نایاب تحریریں دیکھیں تو مجھے اس کہانی کا خیال آیا۔ آپ کہیں تو میں اس کہانی کی نقل بھیج دوں۔ کسی اور موقع پر آپ کام میں لاسکتے ہیں۔''

ڈاکٹر فاطمی کا مندرجۂ بالا خط اسی وقت راقم کے پیش نظر آگیا تھا جس کے بعد میں نے ڈاکٹر ابرار رحمانی سے گزارش کی تھی کہ اگر کسی طور پر ممکن ہوسکے تو پروفیسر فاطمی سے یہ نایاب افسانہ طلب کرکے اور ''آجکل'' کے کسی شمارے میں شائع کرکے آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کردیں۔ میری تجویز سے ڈاکٹر ابرار رحمانی کلی طور پر متفق تھے مگر افسوس کہ دیگر مصروفیات کے باعث میری گزارش ان کے ذہن میں نہ رہ سکی اور بعد ازاں وہ ''آجکل'' کو خیرباد کہہ کر ''یوجنا'' میں چلے گئے۔ اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ وقت گزرنے کے ساتھ میرے ذہن سے

بھی۔ پروفیسر فاطمی کا خط اتر گیا اور مجھے ''آسمان کی پری'' بھی یاد نہ رہی۔ مگر حُسنِ اتفاق سے حکومتِ ہند کی وزارتِ تہذیب و ثقافت نے راقم کو اوائل اپریل 2007 میں پریم چند کی تمام اردو ہندی تخلیقات کا زمانۂ اشاعت متعین طور پر معین کرنے کی غرض سے سینئر فیلوشپ ایوارڈ کردی۔ اس پروجیکٹ پر تحقیقی کام کرنے کے دوران ایک روز یک بیک ''آسمان کی پری'' اور اس کے حوالے سے پروفیسر فاطمی کا خط مجھے یاد آیا اور میں نے فوراً ''آجکل'' کا متعلقہ شمارہ نکال کر مذکورہ خط پھر سے بغور پڑھا۔ نتیجتاً دل میں اشتیاق پیدا ہوا اور چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری سے ڈاکٹر فاطمی کا فون نمبر دریافت کیا اور انھیں فون کیا۔ پروفیسر فاطمی سے میرا نہ تو کوئی پیشتر تعارف تھا اور نہ ہی کبھی ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا مگر میرے ایک فون پر ہی انھوں نے جس حسنِ اخلاق اور دلی وسعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پریم چند کا یہ نایاب افسانہ فوری طور پر ارسال کردیا، اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

اگر محترم پروفیسر علی احمد فاطمی سے برسوں تک سینے سے نہ لگائے رکھتے اور ڈاکٹر ابرار رحمانی اس سے متعلقہ پروفیسر فاطمی کے خط کو ''آجکل'' میں شائع نہ کرتے تو خدا ہی بہتر جانے کہ اس ''آسمان کی پری'' کو ابھی اور کتنا وقت گمنامی کے تاریک غار میں گزارنا پڑتا۔ لہٰذا ان دونوں حضرات کا میں تہہ دل سے متشکر ہوں جن کے بغیر میں پریم چند کا یہ نایاب افسانہ ادبی دنیا کے حوالے کرنے میں کامیاب نہ ہوسکتا تھا۔

قسمت کی خوبی کہ شادی بیاہ کے معاملے میں انسان کا بس نہیں چلتا جس سے خدا نے یا اس کے نائب، برہمن، نے ناتا جوڑ دیا وہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ بابو بھارت داس نے لیلا کے لیے قابل شوہر تلاش کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا لیکن ان کی مراد پوری نہیں ہوئی۔ وہ اپنی لڑکی کو سکھی دیکھنا چاہتے تھے۔ ہر شخص اپنی اولاد کے لیے یہی تمنا رکھتا ہے لیکن بابو بھارت داس کی نظر میں سب سے ضروری چیز جائیداد تھی۔ حسنِ اخلاق اور تعلیم پر زیادہ نظر نہ تھی۔ حسنِ اخلاق کسی کی پیشانی پر نہیں لکھا ہوتا اور تعلیم کی اس زمانے میں قدر ہی کیا؟ ہاں اگر جائیداد کے ساتھ تعلیم بھی ہو تو کیا کہنا۔ انھوں نے چاروں طرف نظر دوڑائی مگر یہ بات کہیں نظر نہ آئی۔ دو چار خاندان ملے بھی تو وہ اپنی برادری کے نہ تھے۔ اگر برادری مل گئی تو زائچہ نہیں ملا اور زائچہ مل گیا تو شرائط طے نہ ہوسکیں۔ مجبوراً بابو بھارت داس کو اپنی لیلا کی شادی لالہ سنت سرن کے لڑکے سیتا سرن سے کرنا پڑی۔ سیتا سرن اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ کچھ تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ گفتگو سلیقے سے کرتا تھا۔ بات کو سمجھتا تھا۔ طبیعت میں رنگیلا پن بھی تھا۔ سب سے بڑی بات اس میں یہ تھی کہ خوبصورت، خوش مزاج اور طاقتور جوان تھا لیکن خیالات وہی باوا آدام کے تھے۔ یعنی پرانی باتیں اچھی اور نئی ساری باتیں خراب۔ جائیداد کے معاملے میں تو زمیندار صاحب بال کی کھال نکالتے تھے، اس میں اپنا کچھ اختیار نہ تھا لیکن رسوم معاشرت کا یہ پہلے درجہ کا حامی تھا۔ سیتا سرن جو کچھ اپنے باپ کو کہتے یا کرتے سنتا اور دیکھتا تھا وہی خود بھی کہتا اور کرتا تھا۔ خود سوچنے کی اس میں قوت نہ تھی۔ اس کی عقل کا ثبوت زیادہ تر معاشرتی قضیوں کی صورت میں ظاہر ہوا کرتا تھا۔

(2)

لیلا نے جس دن گھر میں قدم رکھا اسی دن سے گویا اس کا امتحان شروع ہوگیا وہ سب کام جن کی اس کے گھر میں تعریفیں ہوا کرتی تھیں یہاں ممنوع تھے۔ اس کو نوعمری کے زمانے ہی سے تازہ ہوا کی خوبیاں سمجھائی گئی تھیں، مگر یہاں چہرہ کھولنا تک گناہ تھا۔ اس کو تعلیم دی گئی تھی کہ روشنی زندگی ہے مگر یہاں روشنی کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ گھر پر اس کو رحم، مہربانی اور انصاف کے اوصاف بتائے گئے تھے مگر یہاں ان کا نام لینے تک کی اجازت نہ تھی۔ سنت سرن بہت تیکھا اور غصہ ور آدمی تھا۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ زمانہ سازی سے اس نے دولت پیدا کی تھی اور اس کی نظر میں زندگی کے لیے سب سے بڑی خوبی یہی تھی۔ سنت سرن کی اہلیۂ محترمہ دو چار قدم ان سے بھی آگے تھیں۔ کیا مجال کہ بہو اپنی کوٹھری کے دروازے ہی پر آکر کھڑی ہوسکے یا چھت پر چہل قدمی کرسکے۔ قیامت برپا ہوجاتی۔ سر پر آسمان اٹھالیتی۔ انھیں بک بک جھک جھک کا مرض تھا۔ اگر اتفاق سے دال میں نمک کچھ زیادہ ہوگیا تو بس، دن بھر چیخنے چلانے کے لیے بہانہ مل گیا۔ موٹی تازی عورت تھی۔ چھینٹ کا گھاگھر یدار لہنگا پہنے اور زیورات سے سرتاپا لدی ہوئی سامنے پاندان رکھے سارے دن دھرنا دھرے ایک جگہ بیٹھی رہتی۔ مجال کیا کہ اس کی اجازت کے بغیر گھر میں ایک پتا بھی ہل جائے۔ بہو کی نئی نئی باتیں دیکھ کر دل میں کڑھتی۔ اب آبرو کیسے بچے گی؟ منڈیر پر کھڑی ہوکر جھانکتی ہے، میری لڑکی ایسی دیدہ دلیر ہوتی تو گلا گھونٹ دیتی۔ نہیں معلوم اس کے یہاں کیسے آدمی بستے ہیں۔ گہنے پاتے کا اس کو شوق نہیں جب دیکھو ننگی بوچی بنی بیٹھی رہتی ہے، یہ بھی کوئی اچھے لچھن ہیں۔ لیلا کی وجہ سے سیتا سرن کو بھی جھاڑ پڑتی، تجھے بھی چاندنی میں سونا اچھا لگتا ہے کیوں؟ تو بھی اپنے کو مرد کہے گا۔ وہ بھی کیا مرد کہ جو عورت اس کے کہنے میں نہ ہو۔ دن بھر گھر میں گھسا رہتا ہے۔ منہ میں زبان نہیں ہے، سمجھتا کیوں نہیں۔

سیتا سرن جواب دیتا: اماں، میرے سمجھانے سے کوئی مانے تب تو۔

ماں: مانے گی کیوں نہیں۔ تو مرد ہے کہ نہیں؟ مرد وہ کہ کڑی نگاہ سے دیکھے تو عورت کانپ اٹھے۔

سیتا: تم تو اسے سمجھاتی رہتی ہو!

ماں: میری اسے کیا پروا؟ سمجھتی ہوگی کہ بڑھیا چار دن میں مرجائے گی تو

گھر کی مالک میں بن جاؤں گی۔

سیتا: میں خود بھی اس کی باتوں کا جواب نہیں دے سکتا۔ دیکھتی نہیں ہو کتنی کمزور ہوگئی ہے، وہ رنگ ہی نہیں رہا۔ کوٹھری میں پڑے پڑے اس کی حالت بگڑتی جاتی ہے۔

بیٹے کی زبان سے اس قسم کی باتیں سن کر وہ آگ بگولہ ہوجاتی۔ سارے دن جلتی اور کڑھتی۔ کبھی قسمت کو برا بھلا کہتی، کبھی زمانے کو۔

سیتا سرن اپنی والدہ کے سامنے تو ایسی باتیں کر لیتا تھا مگر لیلا کے سامنے ہوتے ہی اس کی رائے بدل جاتی تھی۔ وہ بھی وہی باتیں کرتا جو لیلا کو پسند ہوتیں۔ حتیٰ کہ دونوں مل کر بڈھیا کا ہنسی مذاق اڑاتے۔ لیلا کو اس گھر میں کوئی اور آرام نہ تھا وہ سارے دن کڑھا کرتی۔ وہ چولھے کے سامنے کبھی نہیں بیٹھی تھی مگر یہاں پانسیر یوں آٹا تھوپنا پڑتا تھا اور مزدوروں اور ٹھلوں کے لیے بھی روٹیاں پکانا پڑتیں۔ کبھی کبھی وہ چولھے کے سامنے بیٹھ کر گھٹنوں رویا کرتی۔ یہ بات نہ تھی کہ یہ لوگ رسوئیا ملازم نہیں رکھ سکتے تھے لیکن خاندان کی پرانی رسم یہی تھی کہ بہو کھانا پکائے اور اس رسم کو پورا کرنا ضروری تھا۔ سیتا سرن کو دیکھ کر لیلا کی طبیعت ذرا بہل جایا کرتی تھی۔

گرمی کے دن تھے اور شام کا وقت۔ باہر ہوا چل رہی تھی لیکن اندر دم گھٹتا تھا۔ لیلا کوٹھری میں بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی کہ سیتا سرن نے آکر کہا:

''یہاں بہت سخت گرمی ہے باہر چل کر بیٹھو۔''

لیلا: یہ گرمی ان طعنوں سے کہیں اچھی ہے جو ابھی سننا پڑیں گے۔

سیتا: اگر آج وہ بولیں گی تو میں بھی بگڑ جاؤں گی۔

لیلا: ایسی حالت میں مجھے گھر میں رہنا دوبھر ہوجائے گا۔

سیتا: بلا سے الگ رہیں گے۔

لیلا: مجھے مرنا منظور ہے لیکن الگ رہنا گوارا نہیں۔ وہ جو کچھ کہتی سنتی ہیں اپنی سمجھ میں میرے بھلے کے لیے کہتی ہیں وہ میری دشمن تو ہیں نہیں۔ ان کی باتیں ہمیں اچھی نہ لگیں یہ دوسری بات ہے۔ انھوں نے خود بھی یہ مصیبتیں جھیلی ہوں گی جواب میں جھیل رہی ہوں۔ ان کی طبیعت پر ان مصیبتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ان کی عمر 65 برس کی ہے لیکن مجھ سے کہیں زیادہ تندرست ہیں۔ اس صورت میں انھیں کیا اندازہ ہوسکتا ہے کہ ایسی مصیبتوں سے صحت خراب ہوسکتی ہے۔ سیتا سرن نے اس کے پژمردہ چہرے کی طرف ہمدردانہ نظروں سے دیکھ کر کہا:

''تمھیں اس گھر میں بہت دکھ سہنا پڑا۔ یہ گھر ہرگز تمھارے لائق نہ تھا۔ گذشتہ جنم میں ضرور تم نے کوئی گناہ کیا ہوگا۔''

لیلا نے اپنے شوہر کا ہاتھ تھام کر محبت آمیز لہجے میں جواب دیا:

''اگر میں یہاں نہ آتی تو تمھاری محبت مجھے کیونکر ملتی۔''

(3)

پانچ برس گزر گئے۔ لیلا دو بچوں کی ماں ہوگئی۔ ایک لڑکا تھا دوسری لڑکی۔ لڑکی کا نام کامنی تھا۔ دونوں بچے گھر کو گلزار کیے رکھتے تھے۔ لڑکی اپنے دادا سے بہت مانوس تھی اور لڑکا دادی پر جان دیتا تھا۔ دونوں شوخ اور شریر تھے۔ گالی دینا، منہ چڑھانا، ان کے لیے معمولی بات تھی۔ دن بھر کھاتے اور آئے دن بیمار پڑے رہتے۔ لیلا خود تو سب مصیبتیں جھیل چکی تھی مگر یہ اس کو منظور نہ تھا کہ بچوں میں بری عادتیں پیدا ہوں لیکن اس کی کون سنتا تھا۔ بچوں کی ماں ہوجانے پر اب وہ کسی شمار میں نہ تھی۔ بچے سب کچھ تھے وہ کچھ نہ تھی۔ بچوں کو ڈانٹنے ڈپٹنے کا بھی اس کو اختیار نہ تھا۔ ساس پنچھ جھاڑ پیچھے پڑ جاتی۔

سب سے بڑی آفت یہ تھی کہ لیلا کی طبیعت اور بھی خراب ہوگئی تھی۔ ایام زچگی میں اسے وہ تمام سختیاں جھیلنا پڑیں جو نا سمجھی، بیوقوفی اور لکیر کی فقیری کے باعث زچہ کے لیے ضروری خیال کی جاتی ہیں۔ اس غریب کو اس کال کوٹھری میں رہنا پڑا جہاں ہوا اور روشنی کا گزر نہیں، جہاں چاروں طرف بدبو نمی اور گندگی بھری ہوئی تھی۔ اس کا نازک جسم سوکھ کر کانٹا ہوگیا۔ پہلی بار جو کمر رہ گئی تھی دوسری بار وہ بھی پوری ہوگئی۔ چہرہ زرد ہوگیا، آنکھیں اندر کو دھنس گئیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بدن میں خون نہیں رہا۔ صورت ہی بدل گئی۔

گرمیوں کے دن تھے۔ آم اور خربوزوں کی فصل بہت اچھی ہوئی تھی۔ اس مرتبہ پھلوں میں غیر معمولی شیرینی تھی۔ سنت سرن کے علاقے سے آم اور خربوزوں کے ٹوکرے چلے آتے تھے۔ گھر بھر آستین چڑھا کر کھانے بیٹھ جاتا۔ بابو صاحب پرانی ہڈی کے آدمی تھے۔ علی الصبح ایک سیکرہ آموں کا ناشتہ کرتے، اس کے بعد پسیری بھر خربوزے چٹ کر جاتے۔ ان کی اہلیہ بھی ان سے کم نہ تھیں۔ انھوں نے ایک وقت کا کھانا ہی بند کر دیا تھا۔ اناج سڑنے والی چیز نہیں آج خرچ نہیں ہوا تو کل ہوجائے گا۔ آم اور خربوزے تو ایک دن بھی نہیں ٹھہر سکتے۔ ان کو شدنی کہنا چاہیے ورنہ ہر سال دونوں چیزوں کی ریل پیل ہوتی تھی۔ کبھی کسی کو کچھ شکایت نہ ہوئی۔ کبھی پیٹ میں گرانی معلوم ہوئی تو ہڑ کی پھنکی مار لی۔ ایک دن بابو سنت سرن کے پیٹ میں میٹھا میٹھا درد ہونے لگا۔ انھوں نے اس کی پروا نہ کی۔ آم کھانے بیٹھ گئے۔ سیکرہ پورا کر کے اٹھے ہی تھے کہ قے ہوئی۔ گر پڑے۔ پھر تو قے پر قے اور دست پر دست ہونے لگے۔ ہیضہ ہوگیا۔ شہر سے ڈاکٹر بلائے گئے لیکن ان کے آنے سے پہلے ہی بابو صاحب چل بسے تھے۔ رونا پیٹنا مچ گیا۔ شام ہوتے ہوتے گھر سے لاش نکلی۔ لوگ آدھی رات گئے مرگھٹ سے واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کی اہلیہ کو بھی دست اور قے ہو رہے ہیں۔ پھر دوڑ دھوپ شروع ہوئی لیکن سورج نکلتے نکلتے وہ بھی سدھار گئیں۔ زندگی بھر میاں بیوی ایک دن کے لیے بھی ایک دوسرے سے الگ نہ ہوئے تھے، دنیا سے بھی ساتھ ہی ساتھ گئے۔ شام کو میاں کا انتقال ہوا، صبح کو

بیوی کا۔

لیکن مصیبت کا خاتمہ ہنوز نہ ہوا تھا۔ لیلا سنسکار کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ مکان کی صفائی وغیرہ کا کسی نے خیال نہ کیا تیسرے دن دونوں بچے دادا دادی کے لیے روتے روتے بیٹھنے میں جا پہنچے۔ وہاں طاق میں ایک کٹا ہوا خربوزہ پڑا تھا۔ دو تین قلمی آم ترشے رکھے تھے۔ مکھیاں ان پر بھنک رہی تھیں۔ جانکی نے تپائی پر چڑھ کر دونوں چیزیں اتار لیں اور دونوں نے مل کر کھائیں۔ شام ہوتے ہوئے دونوں کو ہیضہ ہو گیا اور دونوں اپنے غم نصیب والدین کو روتا چھوڑ کر چل بسے۔ گھر میں تاریکی ہو گئی۔ تین دن پہلے جہاں ہر طرف چہل پہل تھی وہاں اب ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کسی کے رونے تک کی آواز نہ آتی تھی۔ روتا کون؟ لے دے کر گھر میں صرف دو آدمی تھے اور انھیں رونے کی بھی مہلت نہ تھی۔

(4)

ہم بتا چکے ہیں کہ لیلا کی طبیعت پہلے ہی خراب تھی۔ اب وہ زندہ درگور ہو گئی۔ اٹھنے بیٹھنے کی بھی طاقت نہیں رہی، ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہتی تھی۔ نہ کپڑے لتے کی فکر نہ کھانے پینے کی پروا۔ گھر سے واسطہ نہ باہر سے غرض۔ جہاں بیٹھی وہیں بیٹھی رہ جاتی۔ مہینوں کپڑے نہیں بدلتی، نہ سر میں تیل ڈالتی۔ بچے اس کی زندگی کا سہارا تھے۔ جب وہ نہیں رہے تو اب موت اور زندگی برابر ہے۔ اس کی ہر وقت یہی دعا تھی کہ پرمیشور، اب مجھے دنیا سے اٹھا لے۔ میں نے دنیا کے سب آرام پا لیے۔ اب کسی بات کی تمنا نہیں رہی لیکن منہ مانگی موت کس کو ملتی ہے۔

سیتا سرن بھی پہلے تو بہت رویا دھویا۔ یہاں تک کہ گھر چھوڑ کر بھاگ بھاگ جاتا تھا لیکن جوں جوں دن گزرتے جاتے تھے بچوں کا غم اس کے دل سے مٹتا جاتا تھا۔ اولاد کا غم تو کچھ ماں ہی کو ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کی طبیعت سنبھل گئی۔ پہلے کی طرح یار دوستوں کے ساتھ ہنسی دل لگی ہونے لگی۔ یاروں نے اور روغن قاز ملا۔ اب وہ گھر کا مالک تھا۔ سب کچھ کر سکتا تھا۔ کوئی اس کا ہاتھ روکنے والا نہ تھا۔ سیر سپاٹے کرنے لگا۔ کہاں تو لیلا کو روتے دیکھ کر اس کی بھی آنکھیں بھر آتی تھیں، کہاں اب اس کو اس اور غمگین دیکھ کر جھنجلا اٹھتا۔ زندگی صرف رونے کے لیے نہیں ہے۔ اشور نے بچے دیے تھے، اشور ہی نے چھین لیے اب کیا ان کے لیے مر جائیں۔ لیلا یہ باتیں سن کر حیران ہو جاتی۔ کیا باپ کے منہ سے اس قسم کے الفاظ نکل سکتے ہیں؟ کیا دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں؟

ہولی کے ایام تھے۔ مردانے میں گانا بجانا ہو رہا تھا۔ یار دوستوں کی دعوت کا سامان تھا۔ اندر لیلا زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے سب تیج ہار رونے دھونے میں گزرتے تھے۔ اس کو یہ خیال ہوتا تھا کہ آج بچے ہوتے تو اچھے اچھے کپڑے پہن کر اچھلتے، کودتے پھرتے، جب وہی نہیں رہے تو کہاں کی تیج اور کہاں کے تیوہار۔

اسی اثنا میں سیتا سرن اندر آیا۔ اس نے لیلا سے کہا "کیا دن بھر روتی رہو گی؟ یہ تم نے اپنی کیا گت بنا رکھی ہے اٹھو اور کپڑے بدل کر آدمی بن جاؤ۔"

لیلا: تم جا کر اپنی محفل گرم کرو، تمھیں میری فکر کیوں؟

سیتا: دنیا میں کیا کبھی کسی اور کے بچے نہیں مرتے، تمھارے ہی سر تو یہ مصیب آئی نہیں۔

لیلا: یہ بات کون نہیں جانتا۔ اپنا اپنا دل ہے اس پر تو کسی کا بس نہیں چلتا۔

سیتا: آخر میرے بھی تو کچھ حقوق تم پر ہیں۔

لیلا نے بنظر استعجاب اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ گویا ان کی بات نہیں سمجھی۔ بعد ازاں دوسری طرف منہ کر کے رونے لگی۔

سیتا: میں اب اس نحوست کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تمھیں اپنے دل پر قابو نہیں ہے تو میرا دل بھی میرے قابو میں نہیں ہے۔ میں زندگی بھر ماتم نہیں منا سکتا۔

لیلا: تم رنگ رلیاں مناتے رہو، میں تمھیں منع نہیں کرتی۔ میں روتی ہوں تو مجھے کیوں نہیں رونے دیتے؟

سیتا: میرا گھر رونے کے لیے نہیں ہے۔

لیلا: اچھی بات ہے، اب تمھارے گھر میں نہیں روؤں گی۔

(5)

لیلا نے دیکھا کہ شوہر ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے۔ ان پر ایک بھوت سوار ہے اور کوئی سمجھانے والا نہیں۔ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہیں۔ اگر میں جاتی ہوں تو گھر خاک میں مل جائے گا۔ ان کا وہی حال ہوگا جو خود غرض اور مطلب پرست دوستوں کے چنگل میں پھنس کر نوجوان رئیسوں کا ہوا کرتا ہے۔ کوئی بے حیا گھر میں آ جائے گی اور ان کو تباہ کر ڈالے گی۔ ایشورا میں کیا کروں؟ اگر یہ کسی مرض میں مبتلا ہو جاتے تو کیا اس حالت میں ان کو چھوڑ کر میں چلی جاتی؟ ہرگز نہیں۔ میں دل و جان سے ان کی خدمت کرتی، دعائیں کرتی، منتیں مانگتی۔ درست ہے کہ ان کو کوئی جسمانی مرض نہیں ہے لیکن روحانی روگ ضرور ہے جو شخص رونے کی جگہ ہنسے اور ہنسنے کی جگہ روئے اس کے دیوانہ ہونے میں کون شک کر سکتا ہے۔ اگر میں چلی گئی تو یہ تباہ ہو جائیں گے۔ ان کو بچانا میرا فرض ہے!

ہاں، مجھے اپنا غم بھول جانا چاہیے، روؤں گی، رونا میری تقدیر میں لکھا ہے لیکن ہنس ہنس کر روؤں گی۔ اپنی قسمت سے جنگ کروں گی، جو جاتے رہے ان کے لیے سوا رونے کے اور کیا کر سکتی ہوں۔ لیکن جو موجود ہے اس کو نہیں جانے دوں گی۔ آہ، اے میرے شکستہ دل آ، تیرے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو جمع کر کے ایک تربت بناؤں اور اپنے غم کو اسی میں دفن کر دوں اے چشمے بہانے والی آنکھو! آؤ اور میرے آنسوؤں کو اپنی پلکوں میں جگہ دو۔ اے میرے

زیورات! بہت دن تک میں نے تمھاری بے قدری کی، میری خطا معاف کرو۔ تم میرے اچھے دنوں کے ساتھی ہو، تم نے میرے ساتھ بہت کچھ سلوک کیے ہیں، اب اس مصیبت میں میرا ساتھ دو۔ لیکن دیکھنا، دغا نہ دے جانا، میرے راز کو پوشیدہ رکھنا۔

لیلا تمام رات اپنے دل سے باتیں کرتی رہی۔ ادھر مردانے میں دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی۔ سیتا سرن نشے میں سرشار، کبھی تالیاں بجاتا اور کبھی گاتا۔ اس کے دوست بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ عیش وعشرت کے سوا کوئی اور کام ان کے لیے نہیں ہے۔

پچھلے پہر محفل میں سناٹا چھا گیا۔ ہاہا ہوہو کی آوازیں بند ہوگئیں۔ لیلا نے خیال کیا کہ یہ لوگ کہیں چلے گئے یا سو گئے؟ ایک دم خاموشی کیوں طاری ہوگئی؟ جا کر دہلیز میں کھڑی ہوگئی اور بیٹھک میں جھانک کر دیکھا۔ تن بدن میں آگ لگ گئی۔ یار دوست رخصت ہو چکے تھے۔ تماشائیوں کا بھی پتہ نہ تھا۔ مسند پر ایک بازاری عورت لیٹی ہوئی تھی اور سیتا سرن جھکا ہوا اس سے کچھ باتیں کر رہا تھا۔ دونوں کے چہرے اور آنکھوں سے ان کے دلی جذبات ظاہر وآشکار تھے۔ ایک کی آنکھوں میں محبت تھی، دوسری کی آنکھوں میں بے وفائی۔ ایک بھولا بھالا دل ایک مکارہ کے چنگل میں پھنس رہا تھا۔ لیلا کی جائیداد اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ڈائن چرائے لیے جا رہی تھی۔ لیلا غصے میں بھر گئی۔ اس نے چاہا کہ اسی وقت اس حرامزادی کو آڑے ہاتھوں لوں۔ ایسا دھتکاروں کہ کمبخت یاد کرے۔ کھڑے کھڑے باہر نکال دوں۔ وہ نسوانی جذبات جو بہت دن سے سوئے ہوئے تھے ایک دم بیدار ہوگئے۔ لیکن اس نے صبر و برداشت سے کام لیا۔ وہ الٹے پاؤں اندر چلی گئی۔ جب طبیعت کو ذرا سکون ہوا تو خیال کرنے لگی کہ رنگ روپ، ادا و ناز اور نخرے تلّے میں میں اس بے حیا کی ہمسری نہیں کر سکتی۔ وہ بالکل چاند کا ٹکڑا ہے اس کے عضو عضو میں شوخی وشرارت ہے۔ اس کی آنکھیں ہیں کہ دل وجگر کو برمائے دیتی ہیں۔ لیلا اس وقت آئینہ کے سامنے گئی۔ آج کئی مہینے کے بعد اس نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ دیکھتے ہی منہ سے بیساختہ ایک آہ نکل گئی۔ رنج وغم نے اس کا نقشہ بگاڑ دیا تھا۔ اس بازاری عورت کے مقابلے میں اس کی وہی قیمت تھی جو گلاب کے پھول کے سامنے جوہی کے پھول کی ہو سکتی ہے۔

(6)

سیتا سرن کا خمار شام کو ٹوٹا۔ آنکھیں کھلیں تو دیکھا کہ لیلا سامنے کھڑی مسکرا رہی ہے۔ اس کی ادائیں آنکھوں میں کھب گئیں۔ بیحد خوشی ہوئی۔ گویا مدتوں کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ اس کو کیا خبر تھی کہ لیلا نے یہ سوانگ بھرنے کے لیے کس قدر آنسو بہائے ہیں۔ سیتا سرن نے ایک خاص جذبۂ محبت سے لیلا کو سینے سے لگا لیا اور ہنس کر کہا: ''آج تو تم مسکراتی نظر آتی ہو۔ کہاں بھاگ کر جاؤں؟''

لیلا نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا: ''یہاں آبیٹھو۔ بہت بھاگے بھاگے پھرتے ہو، اب تمھیں میں باندھ کر رکھوں گی۔ باغ کی بہاریں بہت لوٹ چکے ہو اب ذرا اندھیری کوٹھری کی بھی سیر کر دیکھو۔''

سیتا نے شرمندگی سے کہا: ''اسے اندھیری کوٹھری نہ کہو۔ لیلا وہ محبت کا مندر ہے۔''

اسی اثنا میں خبر ملی کہ باہر کوئی دوست تشریف فرما ہیں۔ سیتا سرن اٹھ کر چلنے پر آمادہ ہوا تو لیلا نے ہاتھ پکڑ لیا۔ ''میں نہیں جانے دوں گی۔''

سیتا سرن: میں ابھی واپس آتا ہوں۔''

لیلا: اندیشہ ہے کہ تم کہیں اور نہ چلے جاؤ۔''

سیتا سرن: کیا اب بھی تم کو یہ اندیشہ ہے؟''

باہر پہنچا تو دوست نے مسکرا کر کہا: ''آج کیا تمام دن سوتے ہی رہے ہو؟ اس وقت بہت خوش نظر آتے ہو۔ اس وقت وہاں چلنے کی تجویز قرار پائی تھی، وہ تمھاری راہ دیکھ رہی ہیں۔''

سیتا سرن: چلنے کو تو تیار ہوں لیکن لیلا جانے نہیں دیتی۔''

دوست ''نرے گاؤدی ہو۔ آگئے نا بیوی کی باتوں میں۔ پھر کس برتے پر گرمائے تھے؟''

سیتا سرن: ''لیلا نے گھر سے نکال دیا تھا اس لیے مارا مارا پھرتا تھا۔ اب اس نے پھر دروازہ کھول دیا ہے اور سامنے کھڑی بلا رہی ہے۔''

دوست: ''اجی یہاں وہ مسرّت کہاں۔ گھر کو ہزار سجاؤ مگر وہ باغ نہیں بن سکتا۔''

سیتا سرن: ''بیشک، گھر ہرگز باغ نہیں ہو سکتا، لیکن بہشت ہو سکتا ہے۔ میں اپنی بیوفائی اور سرد مہری پر سخت نادم ہوں اولاد کے جس غم نے اس کو پژمردہ کر دیا تھا میرا ذرا سا اشارہ پا کر اسی غم کو اس نے بھلا دیا اور بھلایا بھی ایسا کہ گویا یہ غم کبھی ہوا ہی نہ تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ بڑی بڑی مصیبتیں سہ سکتی ہے اس کی میری مدد کی چنداں ضرورت نہیں لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس کی پژمردگی کے باعث میری حالت خراب ہو رہی ہے تو وہ اپنا غم بھول گئی۔ آج میں نے اس کو سہاگنوں کی طرح بنی ٹھنی اور مسکراتے دیکھا تو میری بھی طبیعت خوش ہوگئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ آسمان کی پری ہے جو مجھ ایسے کمزور انسان کی حفاظت کے لیے بھیجی گئی ہے۔'' فقط۔

□□□

46-B, New Mandi, Muzaffar Nagar, 251001

ریاض احمد

برصغیر میں اردو فاصلاتی تعلیم کا دائرۂ کار

کسی ملک کے تعلیمی پروگرام اس ملک کی سیاسی آزادی، معاشی ترقی اور تہذیبی وسماجی مساوات کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ چنانچہ برصغیر کے دیگر ممالک عمومی اور ہندوپاک خاص طور سے تعلیمی اعتبار سے ترقی پذیر ہیں، جن میں رسمی طرز تعلیم اپنے تمام افراد کو تعلیم وتدریس سے آراستہ کرنے سے قاصر ہے۔ اس کی وجہ بظاہر ہماری معاشی مجبوری ہے لیکن اس کی سب سے بڑی وجہ بے تحاشہ بڑھتی ہوئی آبادی ہے۔ اس لیے برصغیر کے ماہرین تعلیم اور منصوبہ ساز افراد دونوں اس بات پر پوری طرح متفق ہیں کہ اس مسئلے کا واحد حل فاصلاتی نظام تعلیم کے زیادہ سے زیادہ پھیلاؤ میں ہی ہے۔ اس لیے برصغیر کے ممالک میں خصوصی طور سے قومی تعلیمی نیٹ ورک میں فاصلاتی نظام تعلیم نہایت اہم رول ادا کررہا ہے۔ اس نظام تعلیم کو لے کر شروع شروع میں کچھ خدشات ظاہر کیے جارہے تھے۔ مثلاً یہ کہ اعلیٰ تعلیم کی Quality of Education میں گراوٹ آئے گی۔ تعلیم یافتہ افراد کی بے روزگاری کی شرح میں اضافہ ہوگا۔ دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے تعلیمی اداروں سے فارغ طلبہ کا معیار پست رہے گا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن فاصلاتی نظام تعلیم میں جدید تکنیکی صلاحیتوں کے ذریعے ان خامیوں کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی جارہی ہے اور اس ضمن میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد اور اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، دہلی نشان منزل اور مشعل راہ کا کام کررہی ہیں۔

فاصلاتی طرز تعلیم کی کامیابی اس تمام تر تکنیکی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے پر منحصر ہے۔ یہ ایسا آسان اور سستا نیم رسمی طریقۂ تعلیم ہے جس میں مالی اور افرادی قوتوں کا کم از کم استعمال کرکے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اس طرز تعلیم میں ترک تعلیم کی شرح بہت کم ہے اور اس سے ان افراد کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچتا ہے جنھوں نے کسی وجہ سے اپنی تعلیم درمیان میں ہی نامکمل چھوڑ دی ہے۔ اس طریقۂ تعلیم نے ان افراد کو پھر سے جہانِ درس وتدریس سے جوڑنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ فاصلاتی نظام تعلیم میں روایتی مضامین کے ساتھ ساتھ ان سبھی مضامین کی تدریس کا مکمل اور ٹھوس انتظام ہے جن کی ان ممالک کو سماجی، تکنیکی، معاشی اور اقتصادی حالات میں ضرورت ہے۔ فاصلاتی نظام تعلیم میں خود آموز تدریسی مواد کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس طریقۂ تعلیم میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یا تو استاد کی ضرورت ہوتی ہی نہیں ہے یا پھر بہت محدود ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نظام تعلیم میں جدید تعلیمی ٹیکنالوجی کے استعمال کی وجہ سے اساتذہ کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

ہندوستان میں فاصلاتی نظام تعلیم کی ترویج وترقی کا سرسری جائزہ لیں تو اس نظام تعلیم نے اب تک ترقی کی پانچ منزلیں طے کرلی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فاصلاتی تعلیم کی پانچویں منزل ہمارے سامنے ہے یعنی Inteligent Flexible Learning Model کا استعمال ہمارے بہت سے فاصلاتی تعلیمی اداروں میں شروع ہوگیا ہے اور کوشش کی جارہی ہے کہ فاصلاتی طرز کے سبھی طلبہ کو ان سہولتوں سے فائدہ پہنچایا جائے۔

ضرورت تھی کہ پوری تفصیل بیان کی جاتی لیکن موضوع کے لحاظ سے یہاں گنجائش نہیں۔

ادارہ جاتی اور انتظامی لحاظ سے فاصلاتی نظام کی تین عملی صورتیں ہیں، مطلب یہ کہ اس کی ترویج میں تین طرح کے ادارے کام کررہے ہیں: (الف) اوّل وہ ادارے جنھیں کلی طور پر ہم اوپن یونیورسٹی کہتے ہیں۔ مثلاً علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، دہلی اور بنگلہ دیش اوپن یونیورسٹی، بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، حیدرآباد، نالندہ اوپن یونیورسٹی پٹنہ وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے طرح کے ادارے Dual Model Educational Institutions کہلاتے ہیں۔ ان اداروں میں رسمی تعلیم کے شعبے کے ساتھ ساتھ فاصلاتی تعلیم کے شعبے بھی ہوتے ہیں جو مختلف ناموں سے پکارے جاتے ہیں۔ مثلاً Directorate of Distance Education (نظامت فاصلاتی تعلیم)، شعبۂ فاصلاتی تعلیم، اسکول آف ڈسٹینس ایجوکیشن، Centre for Distance & Open Learning، شعبۂ مراسلاتی تعلیم، Department of Continuing Education وغیرہ۔ ان اداروں کی مثال مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، عثمانیہ یونیورسٹی، پٹنہ یونیورسٹی سے دی جاسکتی ہے۔

فاصلاتی نظام تعلیم میں تیسری طرح کے اداروں کی مثال (NIOS) National Institute of Open Schooling سے دی جاسکتی ہے، جس کا صدر دفتر دہلی میں قائم ہے اور اس کے تعلیمی مراکز ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں، اس کے ذریعے تقریباً سبھی جدید ہندوستانی زبانوں کو میڈیم بنا کر ثانوی اور اعلیٰ ثانوی امتحان دیے جاسکتے ہیں، نیز اس ادارے کے ذریعے اردو زبان کو میڈیم بنا کر طلبہ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی امتحان

پاس کرسکتے ہیں۔

مختلف ممالک میں فاصلاتی تعلیم کی اصطلاح الگ الگ استعمال کی جاتی ہے۔ مثلاً کہیں مراسلاتی تعلیم، جاری تعلیم، تا حیات تعلیم، آزادانہ تعلیم تو کہیں آزادانہ تعلیمی پروگرام، آف (Off) کیمپس تعلیم، ایکسٹینشن تعلیم، Education in Air وغیرہ۔

برصغیر کے خطے کو زبانوں کا گلدستہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ اس خطے میں بہت ساری چھوٹی بڑی قدیم و جدید زبانیں بولی اور لکھی جاتی ہیں۔ ان سبھی زبانوں میں اردو کو سب سے بڑی رابطے کی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ گویا یہ برصغیر کے ہر حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ دنیا میں جو زبانیں رابطے کی زبان کی حیثیت رکھتی ہے ان کا استعمال ذریعۂ تعلیم میں بہت مفید ہوتا ہے۔ اردو برصغیر کے سیکڑوں رسمی تعلیمی اداروں میں ذریعۂ تعلیم کی زبان ہے جب کہ متعدد اداروں میں مادری زبان اور جدید ہندوستانی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔ فاصلاتی ذریعۂ تعلیم میں بھی بہت سارے اداروں میں اردو ذریعۂ تعلیم ہے جبکہ فاصلاتی تعلیمی اداروں میں جدید ہندوستانی زبان اور مادری زبان کا درجہ رکھتی ہے۔

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد کا شمار جدید فاصلاتی تعلیمی اداروں میں سرفہرست ہے۔ اس کا قیام 1974 میں ہوا تھا۔ یہ ایشیا کی سب سے پہلی اردو میڈیم اوپن یونیورسٹی ہے۔ اس یونیورسٹی کے سبھی کورسیز کا میڈیم اردو ہے۔ یہاں تقریباً گیارہ سو کورسیز اردو میڈیم کے ذریعے پڑھائے جارہے ہیں جب کہ تقریباً ایک سو کورسیز کا تعلق صرف اردو زبان و ادب سے ہے۔ ان تمام تعلیمی پروگراموں کو مختلف زمروں اور گروپوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

International Marketing Group

بین الاقوامی تجارتی گروپ

Population Studies Group

مطالعۂ آبادی گروپ

Language and Literature Group

زبان وادب گروپ

Mass Communication Group

ترسیل عامہ گروپ

Islamic Studies Group

اسلامی مطالعہ گروپ

Library and Information Science Group

لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس گروپ

Social Science Group

سماجی سائنس گروپ

General & Open Group

جنرل واوپن گروپ

یہ سارے گروپ انڈر گریجویٹ پروگرام کے تین سالہ کورس اور پوسٹ گریجویٹ کورسیز پر مشتمل ہیں۔ یہ صرف مثال کے طور پر پیش کیے گئے کیونکہ سبھی کورسیز اور پروگراموں کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں فاصلاتی تعلیم کے ذریعے ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم یعنی پی ایچ ڈی تک کا انتظام اردو کے ذریعے ہے۔ یہ ادارہ دور دراز کے گاؤں سے لے کر بڑے بڑے شہروں کے عوام کی ضروریات کے مطابق کورسیز اور پروگرام تیار کرتا ہے۔ ایک حالیہ تحقیق کے مطابق یہاں اردو میڈیم کورسیز کی تعداد 1069 ہے جس میں 99 کورسیز اردو زبان و ادب سے متعلق ہیں۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے 35 ریجنل سینٹرس ہیں اور تقریباً 2000 اسٹڈی سینٹرس ہیں۔ اب اس ادارے نے بیرونی ممالک میں خاص طور سے خلیجی اور مشرق وسطی کے ممالک میں اپنے ریجنل اور اسٹڈی سینٹرس قائم کیے ہیں۔

ہندوستان میں فاصلاتی تعلیم کا سلسلہ پاکستان سے قدرے پرانا ہے۔ یہاں 1962 میں سب سے پہلے دہلی یونیورسٹی میں مراسلاتی کورس کے ذریعے اس کی شروعات ہوئی تھی۔ دہلی یونیورسٹی کے بعد ہندوستان نے باضابطہ فاصلاتی نظام تعلیم کے میدان میں قدم رکھتے ہوئے حیدرآباد میں مکمل اوپن یونیورسٹی 1982 میں قائم کیا۔

ایک سینٹرل اوپن یونیورسٹی، اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کے علاوہ دیگر 12 اسٹیٹ اوپن یونیورسٹیاں قائم ہوچکی ہیں جبکہ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے متعدد رسمی تعلیمی یونیورسٹیوں نے اپنے یہاں فاصلاتی تعلیم کے شعبے اور Directorate قائم کیے۔ آج کل ان کی تعداد سو سے زیادہ ہے۔ ان سارے اداروں کا نام گنوانا تو اس وقت ممکن نہیں تاہم کلی اوپن یونیورسٹیوں کے نام بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ ان کے نام، سن قیام کی ترتیب سے اس طرح ہیں:

ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، حیدرآباد؛ اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، نئی دہلی؛ کوٹا اوپن یونیورسٹی، راجستھان؛ نالندہ اوپن یونیورسٹی، پٹنہ؛ یشونت راؤ چوہان اوپن یونیورسٹی، ناسک؛ مدھیہ پردیش بھوج اوپن یونیورسٹی، بھوپال؛ کرناٹک اسٹیٹ اوپن یونیورسٹی، میسور؛ باباصاحب امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، احمد آباد؛ نیتاجی سبھاس اوپن یونیورسٹی کولکاتا؛ اترپردیش راج رشی ٹنڈن اوپن یونیورسٹی، الہ آباد؛ تمل ناڈو اسٹیٹ اوپن یونیورسٹی، چینئی؛ اترانچل اوپن یونیورسٹی، نینی تال اور پنڈت سندرلال شرما اوپن یونیورسٹی،

بلاسپور (چھتیس گڑھ)۔

اب سوال یہ ہے کہ فاصلاتی طریقۂ تعلیم سے اردو کی ترویج و ترقی میں کیا مدد مل رہی ہے، تو اس کا جواب ہاں میں ہے۔ اردو زبان کی ترویج و ترقی بذریعے فاصلاتی تعلیم تین سطحوں پر ہوتی ہے۔

اس طرز تعلیم کے ذریعے تقریباً 25 یونیورسٹیوں اور اداروں میں اردو کی تدریس کا انتظام ہے جن میں کچھ یونیورسٹیوں میں انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ، دونوں سطحوں پر اردو کی تدریس کا انتظام ہے۔ کچھ میں صرف انڈر گریجویٹ اور کچھ میں صرف پوسٹ گریجویٹ۔ جن یونیورسٹیوں میں پوسٹ گریجویٹ یعنی ایم اے اردو کا بذریعۂ فاصلاتی تعلیم انتظام ہے ان کی تعداد تقریباً دس ہے اور وہ ہیں کرناٹک اسٹیٹ اوپن یونیورسٹی، کشمیر یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی، بہار یونیورسٹی مظفر پور، للت نرائن متھلا یونیورسٹی دربھنگہ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد، پٹنہ یونیورسٹی، مدراس یونیورسٹی اور برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال۔ جن یونیورسٹیوں میں انڈر گریجویٹ اردو تعلیم کا بذریعہ فاصلاتی تعلیم انتظام ہے۔ ان میں کرناٹک اوپن یونیورسٹی، الہ آباد یونیورسٹی، پٹنہ یونیورسٹی، برکت اللہ یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، جموں یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی، انکل یونیورسٹی، بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی حیدرآباد، کیرالا یونیورسٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی۔ یو پی راج رشی ٹنڈن اوپن یونیورسٹی اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی جبکہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں انڈر گریجویٹ کورسیز اردو زبان اور اردو میڈیم میں شروع ہونے والے ہیں۔ جہاں تک اردو میڈیم کا سوال ہے تو انڈر گریجویٹ کورسیز میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ڈاکٹر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، پٹنہ یونیورسٹی اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں اردو میڈیم کی سہولت بھی حاصل ہے۔ اس کے علاوہ اساتذہ کے اردو میڈیم تربیتی کورسیز یعنی بی ایڈ اور ڈپلوما کا انتظام بھی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ و دیگر ادارے بذریعۂ فاصلاتی تعلیم کرتے ہیں۔

یہاں میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا خاص طور سے ذکر کرنا چاہوں گا۔ اس کا سارا تعلیمی نظام اردو میڈیم ہی ہے۔ یہ یونیورسٹی پارلیمنٹ کے ایکٹ نمبر 2 بابت 1997 کے ذریعے 1998 میں ان مقاصد کے حصول کے لیے قائم کی گئی۔ اس کا دائرہ اختیار سارا ہندوستان ہے۔ یہ قومی یونیورسٹی ہے، اس کے قائم کرنے کے اہم مقاصد ہیں:

اردو کے ذریعے پیشہ ورانہ اور فنی مضامین کی تعلیم و تربیت:

اردو زبان میں اعلیٰ تعلیم و تربیت کے خواہش مند افراد کو کیمپس میں اور اس کے ساتھ فاصلاتی ذریعے سے تدریس کے وسیع مواقع فراہم کرنا ہے۔

تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ: واضح رہے کہ اس یونیورسٹی کے پہلے تعلیمی سال 2000-1999 میں داخلہ لینے والے انڈر گریجویٹ طلبہ کی کل تعداد 3650 تھی جبکہ CFN کورس میں داخل طلبہ کی تعداد 124 تھی اور 2004 میں صرف 7 سال کے قلیل عرصے میں اس میں داخل طلبہ کی تعداد 27000 تک پہنچ گئی ہے۔ اس تعداد میں 2007 میں داخلہ لینے والے طلبہ کی تعداد شامل نہیں ہے کیونکہ یہ ابھی حتمی نہیں ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہماری پارلیمنٹ عورتوں کی 33 فیصد سیاسی سیٹ ریزرو کرنے میں قاصر ہے لیکن مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے اپنے کل داخلے میں سے 50 فیصد سے زائد داخلہ خواتین کو دیا ہے۔ اس یونیورسٹی نے تقریباً 120 اسٹڈی سینٹرس قائم کیے ہیں جبکہ اس کے ریجنل سینٹرس کی تعداد 9 ہے، جو پٹنہ، دربھنگہ، دہلی، بھوپال، بنگلور، سرینگر، ممبئی اور رانچی میں قائم ہیں جبکہ یونیورسٹی نے کئی سب ریجنل سینٹرس بھی قائم کیے ہیں جو لکھنؤ، جموں، سنبل اور نوح میں قائم کیے ہیں۔ یونیورسٹی نے مشرق وسطیٰ میں اپنے تعلیمی مراکز اور امتحان کے مراکز کھولنے کے ارادے کے تحت جدہ میں اپنا امتحانی مرکز قائم کیا ہے۔

چنانچہ برصغیر ہندوپاک میں فاصلاتی تعلیم کے ذریعے اردو زبان کا مستقبل روشن ہے تاہم اس کے لیے اردو سے جڑے اداروں، تنظیموں اور مفکروں کو مزید فعال ہونے کی ہنوز ضرورت ہے تاکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی ترقی میں اضافہ ہوتا رہے۔ □□□

پتہ:
College of Teacher Education, Srinagar
Moulana Azad National Urdu University,

ہمارا ای میل، آئی ڈی

Email:urduduniyancpul@yahoo.co.in

قومی اردو کونسل، ماہ نامہ "اردو دنیا" اور سہ ماہی "فکر و تحقیق" سے خط و کتابت
بذریعہ ای میل اب اس پتے پر کریں۔

اظہار اثر

اردو کہانی — کل اور آج

قدیم کہانیاں عام طور پر شہزادوں پریوں اور دیوؤں کی کہانیاں ہوتی تھیں یا چرند و پرند کی ہوتی تھیں۔ دھیرے دھیرے ان کہانیوں نے داستانوں کا روپ لے لیا۔ پھر وہی داستانیں معاشرے کی تہذیبوں کے ساتھ کلاسیکی کہانیوں کے روپ میں ڈھلتی گئیں، جیسے قصۂ چہار درویش، گل بکاولی وغیرہ۔ یہ سب کہانیاں عربی کی کہانیوں سے ماخوذ یا ان کا عکس کہی جاسکتی ہیں۔ اس کے بعد ناول کا دور آیا۔ آج کی کہانی کا تعلق ناول کے فن سے زیادہ قریب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہنری فیلڈنگ Henry Fielding نے انگریزی میں پہلا ناول لکھا تھا جو اٹھارہ حصوں یا جلدوں پر مشتمل تھا۔ اس ناول کا انداز ''الف لیلہ'' سے متاثر تھا کیونکہ اس نے ''الف لیلہ'' کی کہانیوں کی طرح 18 کہانیاں لکھیں جو کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے سے منسلک تھیں۔ ہنری فیلڈنگ کی طرح ہی پہلا ناول لکھنے کے لیے بوکاچیو (Boccaceio) کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ ہنری فیلڈنگ نے ''ٹوم جونس'' (Tom Jones) کے نام سے ناول لکھا تھا۔

بوکاچیو نے ''ڈیا میرن'' کے نام سے ناول لکھا جو 1353 میں شائع ہوا تھا۔ تقریباً اسی زمانے میں ''ٹوم جونس'' بھی شائع ہوا تھا۔ ناول ڈیکامیرن کی، کہانیاں بھی ''الف لیلہ'' اور ''کنٹھا سا گر'' سے متاثر تھیں۔ لفظ ناول (Novel) بھی بوکاچیو ہی نے اپنی کہانیوں کے لیے استعمال کیا تھا۔ اس نے اپنی طویل کہانیوں کو ناول کہا۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ناول کا ماخذ بھی مشرق کی کہانیاں ہی ہیں جن میں قصہ پن کا ہونا ضروری ہوتا تھا۔ اردو زبان کے ابتدائی دور میں بھی یعنی داستان کی منزل سے گزر کر ادب میں زیادہ تر ناول ہی لکھے جاتے رہے ہیں۔ ویسے تو اردو کا پہلا ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کو مانا جاتا ہے لیکن ڈپٹی نذیر احمد سے چار سال قبل شاد عظیم آبادی نے ''بدھوا'' کے نام سے پہلا ناول لکھا تھا۔ اس کے بعد 1876 میں دوسرا ناول ''صورت الخیال'' لکھا۔

1874 میں الطاف حسین حالی نے ''مجلس النسا'' کے نام سے ایک ناول لکھا، اس ناول پر برٹش سرکار نے ان کو چار سو روپئے کا انعام بھی دیا تھا۔ غرض یہ کہ رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، سجاد حسین انجم، راشد الخیری وغیرہ کے علاوہ پچاس سے زائد مصنفین ایسے ہیں جو ابتدائی دور میں ناول لکھتے رہے ہیں، اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ابتدائی دور میں ناول نگاری پر زیادہ توجہ دی گئی اور کوشش کی گئی کہ ناول اصلاحی ہونے کے ساتھ ساتھ عوام پسند بھی ہوں یعنی کہانی نے افسانے کا روپ کب دھارن کیا اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کچھ محققین کا خیال ہے کہ ایڈگر ایلن پو (Edgar Elan Poe) نے افسانہ نگاری کی ابتدا کی تھی۔ ایلن پو کی زندگی سانحات اور حادثات سے بھرپور تھی اس لیے اس نے اپنے دکھوں سے نجات پانے کے لیے افسانے لکھنے شروع کیے۔ ابتدا اس نے جاسوس اور پر اسرار افسانوں سے کی تھی۔ یہ صنف بہت جلد مقبول عام ہوگئی۔ اس کے بعد سر آرتھر کانن ڈائل نے شرلاک ہومز کا کردار تخلیق کرکے انگریزی ادب میں ہنگامہ مچا دیا۔

ہندوستان میں افسانہ نگاری کی ابتدا انیسویں صدی کے آخر سے ہوتی ہے جب راشد الخیری اور ان کے ہم عصروں نے مسلم خواتین کی زبوں حالی کو افسانوی روپ میں پیش کرنا شروع کیا۔ اس دور میں رسالہ ''چمنستان'' کے ایڈیٹر آغا قزلباش، سجاد حیدر یلدرم، امتیاز علی تاج اور نیاز فتحپوری جیسے ادیب آسمان ادب پر ستارے بن کر چمکے ساتھ ہی حجاب امتیاز علی، مسز عبدالقادر، صالحہ عابد حسین اور بہت سی خواتین اردو افسانے کی نوک پلک سنوارتی رہیں اسی زمانے میں پریم چند بھی سامنے آئے۔ بیسویں صدی کے چوتھے دہے تک ممتاز مفتی، ممتاز شیریں، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور عصمت چغتائی وغیرہ کے نام ادبی دنیا پر چھائے رہے۔ یہ سب وہ افسانہ نگار تھے جن کی تخلیقات ادب عالیہ کی حیثیت رکھنے کے باوجود عوام میں بھی بہت مقبول تھیں کیونکہ عوام ان کہانیوں میں اپنے معاشرے کی سچائی دیکھتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد ''ترقی پسند تحریک'' کے مخالف ادیبوں نے ''جدیدیت'' کا سہارا لیا جس کے زیر اثر افسانہ عوامی دلچسپی بڑی حد تک کھو بیٹھا۔ جدیدیا علامتی افسانے کی ابتدا اور اصل پاکستان سے ہوئی تھی کیونکہ پاکستانی تخلیق کار فوجی حکومت کے خوف سے کھل کر دل کی بات نہیں کہہ سکتے تھے۔ اس لیے انھوں نے علامتوں اور اشاروں میں اپنی بات کہنی شروع کردی۔ ان میں استعمال شدہ رمزیہ نکات اور علامات اردو کا عام قاری نہیں سمجھ پاتا تھا۔ یہاں مجھے میر کا ایک شعر یاد آرہا ہے:

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

سچا اور اچھا ادب وہی ہوتا ہے جو عوام میں بھی مقبول ہو اور ناقدین کے

پیانوں پر بھی کھرا اترتا ہو۔

ادب کی تعریف میں کہا جاتا رہا ہے کہ ادب اپنے دور کے معاشرے، معیشت اور تہذیب کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس تعریف کو اگر سچ مان لیا جائے تو تہذیبی ارتقا اور معاشرے میں تبدیلیوں کے ساتھ ادب میں بھی تبدیلی آنا لازمی ہے لیکن کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ماضی کا ادب ادب نہیں رہتا، کیا اسے فرسودہ کہہ کر نظر انداز کیا جاسکتا ہے؟

معاشرہ زمانے کے ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ آج کا معاشرہ اب سے پچاس سال پہلے کے معاشرے سے بہت مختلف ہے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں جو کہانیاں لکھی گئیں وہ اپنے دور کی نمائندہ ہوتی تھیں۔ ان کہانیوں میں جنسی جرائم نہیں ہوتے تھے۔ محبت میں جنسی جذبات کی فطری موجودگی کے باوجود اسے افلاطونی محبت کے پاکیزہ لباس میں پیش کیا جاتا تھا۔ طبقاتی جارحیت کے خلاف آوازیں اٹھائی جاتی تھیں۔ خود غرضیوں خاصیتوں کے ساتھ ساتھ قربانیوں اور رشتوں کی پاکیزگیوں کو بھی تحریر میں لایا جاتا تھا۔ ان میں بہت اچھی کہانیاں بھی ہوتی تھیں، درمیانی درجے کی بھی اور کمزور کہانیاں بھی لیکن سبھی میں کہانی پن موجود ہوتا تھا۔

ہندی کے مشہور نقاد نامور سنگھ نے ایک بار پریم چند کی کسی کمزور کہانی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ جو ادیب کمزور کہانی نہیں لکھ سکتا وہ بہت اچھی کہانی بھی نہیں لکھ سکتا۔

بیسویں صدی کے چوتھے دہے تک اردو زبان میں بے شمار رسالے شائع ہوتے تھے اور لاکھوں کی تعداد میں چھپ کر فروخت بھی ہوتے تھے۔ دہلی سے ساقی، کہکشاں، جمالستان، مشہور اور شمع وغیرہ عوام و خواص کے محبوب رسالے تھے۔ جو افسانوی ادب کو خصوصی اہمیت دیتے تھے۔ اردو کے سبھی ادیب ان رسالوں میں اپنی کہانیاں شائع کراتے تھے۔ اردو کا دوسرا بڑا مرکز لاہور تھا۔ جہاں ادب لطیف، ہمایوں، نیرنگ خیال، بیسویں صدی، مست قلندر، مستانہ جوگی وغیرہ شائع ہوتے تھے۔ یہ رسالے بھی افسانوں کو خصوصیت سے شائع کرتے تھے۔ بیسویں صدی اس دور میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا رسالہ تھا۔ چترا، چترلیکھا، مصور وغیرہ ہفتہ وار فلمی رسالے تھے لیکن وہ افسانے بھی شائع کرتے تھے۔ اسی زمانے میں دلی سے ایک رسالہ ''آریہ ورت'' کے نام سے نکلا۔ ایک رسالہ ''نرالی دنیا'' کے نام سے شائع ہوتا تھا جس کے مدیر فکر تونسوی تھے۔ راقم الحروف نے ''آریہ ورت'' کے ادارے سے ایک پرچہ ''کنول'' شائع کرنا شروع کیا۔ شاید اس زمانے میں یہ اردو زبان کا پہلا پرچہ تھا جو دو رنگوں میں شائع ہوتا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد دہلی سے شائع ہونے والا رسالہ ''شاہراہ'' صف اول کا رسالہ مانا جاتا تھا۔ یہ رسالہ ''ترقی پسند تحریک'' کا ترجمان ہونے کے باوجود خواص و عوام میں مقبول تھا۔ اسی زمانے میں دہلی سے ماہنامہ ''تحریک'' جاری ہوا جس نے ''جدیدیت'' کے میلان کو فروغ دیا۔ یہ دونوں رسالے افسانوی ادب کو اہمیت دیتے تھے۔ 1947 میں ہندوستان اور پاکستان کی کل آبادی 42 کروڑ تھی۔ تقسیم کے بعد ہندوستان کی آبادی 32 کروڑ رہ گئی۔ اس وقت عوام میں خواندگی کا اوسط بھی کم تھا اس کے باوجود اردو کے رسالے اور کتابیں پڑھنے والے لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ آج صرف دہلی کی آبادی ڈیڑھ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ عوام میں خواندگی کا اوسط بھی کئی گنا بڑھ گیا ہے لیکن اردو کے قائین ناپید ہوتے جارہے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو اردو تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہ ہونا ہے لیکن دوسری بڑی وجہ ہمارے ادیبوں کا ایسی چیزیں لکھنے سے گریز ہے جو عوامی دلچسپی کی حامل ہوں۔ ادب صرف خواص کی جاگیر نہیں ہے۔ اعلیٰ ادب کے نام پر رمزیہ انداز میں ایسی چیزیں تخلیق کرتے رہنا جو عوام کی فہم سے بالا ہوں، نہ ادب کی خدمت ہے نہ زبان کی۔

آج بیشتر ماہنامے سہ ماہی بن چکے ہیں اور اکثر رسالے صرف چند سو یا زیادہ سے زیادہ ایک ہزار چھپتے ہیں۔ ایک نئی روش یہ شروع ہوگئی ہے کہ تین مہینے میں کئی سو روپئے قیمت کا ایک ضخیم رسالہ شائع کردیا جاتا ہے جس کی کچھ جلدیں مخصوص لائبریریاں خرید لیتی ہیں یا وہ دولت مند افراد جو قیمتی کتابیں اپنی ڈرائنگ روم لائبریری میں سجا کر اپنے دوستوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ اردو کے کتنے بڑے شیدائی ہیں۔ رسالے میں کیا ہے، کیا نہیں اس سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

جہاں تک مقبول عام ادب کی افادیت کا سوال ہے میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس نے اردو کو زندہ رکھنے میں زبردست معاونت کی ہے۔ یہ طرح طرح کے ''ازموں'' کے تحت کیے جانے والے تجربات ہی ہیں جو اردو قاری کو اردو سے دور لے گئے ہیں۔

ایک بات اور بھی توجہ طلب ہے کہ دنیا کی کوئی زبان صرف ادب کے سہارے زندہ نہیں رہتی۔ ہر زمانے میں اپنی سماجیات، عمرانیات اور سوشل معاملات ہوتے ہیں۔ فلسفہ، سائنس، جغرافیہ، جیومیٹری، ریاضی یہ تمام علوم ہی کسی زبان کو مکمل بناتے ہیں۔ صرف ادبی مباحثوں کے بل پر کوئی زبان زندہ نہیں رہ سکتی۔ یہ بہت ضروری ہے کہ ہم اپنے جرائد کو صرف ادب تک محدود نہ رکھیں بلکہ ان تمام موضوعات کا احاطہ کریں جو ماضی سے مستقبل تک پھیلے ہوئے ہیں۔

□□□

رفعت النساء بیگم

کرناٹک میں اردو نظم

سرزمین کرناٹک اردو شعروادب کا ایک اہم مرکز رہی ہے۔ بہمنی دور کے اہل قلم حضرت خواجہ بندہ نوازؒ اور دیگر بزرگوں سے منسوب تحریریں، ٹیپو سلطان کے عہد کے قلمکاروں اور بیجاپور کے فنکاروں کی اس قدر دین ہے کہ اردو شعروادب کی تاریخ میں ان کی وقعت، وزن اور وقار کے آگے سر تسلیم خم ہیں۔ فخرالدین نظامی کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" اردو کی پہلی مثنوی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک زمانے تک رسل و رسائل کی کمی، طباعت و اشاعت کی کم سہولتوں اور ترسیل کے وسائل کے فقدان کے باعث اردو ہی کیا کسی بھی زبان کا شعروادب اپنے اپنے علاقوں میں محصور رہا۔ اس کے باعث شعروادب پر مقامی چھاپ زیادہ ملتی ہے۔ میلانات، رجحانات، اسالیب اور لہجے کے فرق کو آسانی کے ساتھ محسوس کیا جاسکتا ہے۔ موضوعات کے بارے میں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ان میں تھوڑا بہت جداگانہ رنگ ملتا ہے۔ لیکن بیسویں صدی کے آتے آتے حالات بدلنے لگے اور پھر 1936 کے آس پاس یعنی ترقی پسند تحریک کے آغاز تک تو شعروادب کا کینوس ہی تبدیل ہوجاتا ہے۔ فاصلے مٹ جاتے ہیں، دوریاں سمٹ جاتی ہیں، وطن کی آزادی کے بعد وطنِ عزیز کا کہیں کوئی علاقہ کسی، ہم سایہ محسوس ہونے لگتا ہے۔ بولنے کی حد تک تلفظ اور لہجے میں فرق تو خیر آج بھی ہے لیکن جہاں تک تحریر کا تعلق ہے یہ فرق نسبتاً کم محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اب شمال و جنوب اور مشرق و مغرب کا فرق بے معنی ہو چکا ہے۔ ہماری تحریری زبان ایک ہے، ہمارے موضوعات مشترک ہیں، ہمارا مواد، مواد کے سوتے مشترک ہیں، تھوڑی بہت کسر جو تھی لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تنظیم جدید نے پوری کردی۔ 1956 میں کئی علاقے ادھر سے ادھر اور اس ریاست سے اس ریاست میں شامل ہوئے اور لسانی، شعری و ادبی منظرنامہ ایسا متبدل ہوا کہ اب جانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جانے لگی۔ دوسری ریاستوں کے علاقے اپنے ہوئے اور اپنی ریاست کے علاقے دوسری ریاستوں کے حوالے۔ بیشتر ریاستوں کی طرح کرناٹک میں بھی آزادی کے بعد ترقی پسند تحریک کا زور کم ہو رہا تھا۔ کہنے والے خیر آج جو چاہیں کہہ لیں، ترقی پسند مصنفین کی انجمن اور اس کی شاخیں ہوں لیکن حق تو یہی ہے کہ اس تحریک نے اب اپنا کردار مکمل کرلیا ہے۔ اس دور کے نظم گو شاعروں میں شاہ ابوالحسن ادیب کا نام لینا چاہیے، ادیب کا سنہ پیدائش 1883 اور سنہ وفات 1960 ہے، ظاہر ہے ان کی زیست کا بڑا حصہ آزادی سے پہلے گزرا اور آزادی کے بعد وہ صرف 13 سال زندہ رہے۔ ان کی اہم تخلیقات آزادی سے قبل منصۂ شہود پر آئیں تاہم انھوں نے یہ زمانہ دیکھا اور تھوڑا بہت کہا بھی ہوگا۔ ادیب کرناٹک میں کلاسیکی شاعری کے نمائندہ ہیں، اپنی علمیت اور فارسی پر بعنایت عبور کے باعث انھوں نے بہت لکھا اور خوب لکھا۔ "عقائد ادیب"، "نعیم بہشت"، "صبح محشر"، "یلفار موت" اور "گلزار جست" ان کی اہم مثنویاں ہیں۔ حیدر علی، ٹیپو سلطان، پیغام ٹیپو، رود کاویری اور رنگ سخن ان کی خاص انداز کی نظمیں ہیں۔ ان کی ایک نظم کے دو بند:

باپ اور بیٹا دونوں شیر
ایک مجاہد ایک دلیر
انگریزوں کا ہیر اور پھیر
بھانپ گئے کچھ لگی نہ دیر
بولے وطن ہے ہندوستان
حیدر علی ٹیپو سلطان
انگریزوں کی مکاری
قدم قدم پر تھی جاری
انھوں نے کی غداری
ہوئے اخوت سے عاری
ایسے مرض کا کیا درمان
حیدر علی ٹیپو سلطان

سلیمان خلیب: سلیمان خلیب کے بغیر تو کرناٹک میں اردو نظم کا منظرنامہ مکمل ہی نہیں ہوسکتا۔ سلیمان خلیب کو عموماً طنز و مزاح کا شاعر قرار دیا جاتا ہے۔ سلیمان خلیب کے پاس طنز و مزاح بھی ہے لیکن ان کی شاعری کا مقصد صرف طنز و مزاح نہیں بلکہ انھوں نے معاشرے کی خامیوں، کوتاہیوں، بے اعتدالیوں، ناہمواریوں اور اس کے مضحک پہلوؤں کو نشانہ بنایا ہے۔ وہ معاشرے کے سلگتے پہلوؤں کو اپنا عنوان بناتے ہیں اور جب ان کی نظم مزاح سے ہٹتے ہوئے سنجیدہ موڑ لیتی ہے تو ان کا طنز زہرناکی کی حدوں میں داخل ہوجاتا ہے۔ یہی سلیمان خلیب کی شاعری ہے۔ "پہلی تاریخ"، "ساس بہو"، "چھورا چھوری"، "لکھنوی شاعر کی دکنی بیوی"، "راستے"، "ایک کلرک کی بیوہ" اور ایسی کئی نظمیں ہیں۔ یہاں سلیمان خلیب کے اشعار پیش کرنے سے

عمداً گریز کر رہی ہوں۔'' کیوڑے کا بن'' کی کئی نظمیں قارئین کو ازبر ہوں گی۔

مدنا منظر: کرناٹک کے نامور شاعروں میں شمار ہوتے ہیں، منظر نے قومی، معاشرتی، سیاسی اور صوفیانہ عنوانات کو بھی اختیار کیا ان کی اپنی فکر ہے جس کی وجہ سے ان کے اشعار نکھر جاتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کی مہذب اقدار کو اپنایا، انسان دوستی اور اخوت کے جذبات کو اشعار کا پیرہن دیا کئی نعتِ شریف اور کئی منقبتیں ان کے جذبات کی توثیق ہیں۔ انھوں نے صرف انسانیت کے درس کو اختیار کیا، کسی تحریک یا رجحان کے ہو کر نہیں رہ گئے۔ مدنا منظر پیشہ کے اعتبار سے طبیب تھے، انھوں نے دیکھیے کتنی سچائی، عاجزی اور انکساری کے ساتھ حضورِ رب میں اس کا اعتراف کیا ہے۔

ھوالشافی
مسیحائی میرا منصب نہیں ہے
وہ کار یزداں ہے
خدا نے مجھ کو اس منصب پہ
فائز کر کے
اپنے دستِ پنہاں سے
شفا بخشی مریضوں کو
یہ سب احسان ہے اس کا

حمید الماس: کرناٹک میں اردو شاعری کا ایک بڑا نام ہے، حمید الماس ساری اردو دنیا میں شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں رومان کی چاشنی بھی ہے اور زندگی کے کڑے کوسوں کی آگ برساتی سخت دھوپ بھی، تلخیاں بھی، خود کلامی کا انداز بھی اور بیانیہ بھی۔ وہ اپنی ذات میں گم بھی ہوتے ہیں اور زمانے پر نظر بھی رکھتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باوجود انھوں نے اپنی شاعری کو ترقی پسندی کے حوالے نہیں کیا۔ اپنے لہجے اور اسلوب کو اپنا لہجہ اور اسلوب رکھا۔ ان کی نظمیں پڑھیے تو اندازہ ہوگا کہ شاعر نے اپنے قلب ونظر کو سدا بہار رکھا ہے۔ حمید الماس نظم کے شاعر ہیں۔ نظم '' آخری موڑ'' کے مصرعے ہیں:

میں آرزوئے بشارت کے اس آخری موڑ پر ہوں
یہاں ہر طرف سنگ ہی سنگ ہیں جن کو
سوکھی زبان چاٹتے چاٹتے کٹ گئی ہے

سلیمان خمار: سلیمان خمار نے زندگی کی بے رحمیوں، ظلم وستم، سفاکیوں، ستم ظریفیوں، قہر وغضب، چیرہ دستیوں اور دست درازیوں کی خوب خوب عکاسی کی ہے۔ ان کی زندگی کا مطالعہ گہرائی اور گیرائی رکھتا ہے وہ جو بات کہتے ہیں نشانے پر لگتی ہے۔ کڑوی کسیلی، حقیقتوں کو انھوں نے نہایت عمدگی سے بیان کر دیا ہے۔ ایک نظم ہے'' سمندر''۔

کئی صدیوں سے/ دریاؤں کا پانی بہہ رہا ہے/ سمندر/ پھر بھی پیاسا ہے

اور یہ نظم'' جدید نسل کا المیہ'' دیکھیے:

تم مجھے چاہتے ہو، غلط/ میں تمھیں پیار کرتا ہوں، سب جھوٹ ہے/
سچ تو یہ ہے/ کہ ہم اپنی اپنی ضرورت کے پیچھے پڑے ہیں

شکیل مظہری: شکیل مظہری نے نظمیں لکھی ہیں اور غزلیں بھی اور ہر دو اصناف میں وہ اپنا اعتبار رکھتے ہیں، انھوں نے شعروادب کی کلاسیکی قدروں سے بھی استفادہ کیا ہے اور عصری رجحانات پر بھی نظر رکھی ہے، وہ اپنی بات کو کسی الجھاؤ اور پیچ وخم کے بغیر بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

اب میری تمنا کا/ درد گر نہیں کوئی/ میرے غم پہ رونے کو/ نوحہ گر نہیں کوئی/
دل کی ساری امیدیں/ زخم زخم لگتی ہیں/ نیند کے لیے آنکھیں/ ساری رات جگتی ہیں/
جاگنے کی یہ زحمت/ مجھ کو راس آ جائے/ کاش کوئی ایسے آ جائے/ میرے پاس آ جائے/
اور آ کے آنکھوں میں/ چاندنی کو ٹپکا دے

مظہر محی الدین: مظہر محی الدین کا معاملہ کچھ اور ہے۔ انھوں نے غزلیں بھی خوبصورت کہی ہیں اور نظمیں بھی، ان کی شاعری میں زندگی کی تصویر بھی ہے اور تفسیر بھی۔ اخلاقی اقدار کے زوال، فرد کی بے وقعتی، بے بصیرتی، تہی ذہنی کردار کے کھوکھلے پن اور زندگی کی بے معنویت اور لایعنیت کا انھوں نے فنکارانہ انداز میں اظہار کیا ہے۔ ان کی یہ نظم ملاحظہ ہو:

زندگی/ دیوار پر لٹکا ہوا/ ایک ایسا کیلنڈر ہے/ جس کے سب مہینے کٹ چکے ہیں

حمید سہروردی: ہر تحریک یا رجحان کی طرح جدیدیت میں بھی منفی اور مثبت عناصر ملتے ہیں، لیکن حمید سہروردی نے خواہ افسانے لکھے ہوں یا شاعری کی ہو جدیدیت کے وقار کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اپنے طور پر کچھ اضافہ ہی کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں ابہام تھوڑا بہت ہو لیکن ان کی نظموں میں ابہام کم ہی ملے گا۔ وہ بات صراحت اور وضاحت سے تو نہیں کہتے لیکن ابہام کی تہیں دبیز نہیں اور پھر یہ بھی کہ زندگی سے اپنے رشتہ کو انھوں نے استوار رکھا ہے۔ آس پاس اور اطراف واکناف کی بو باس ان کے یہاں ملتی ہے، شاعر ان کو اپنے ذہن ودل میں جگہ دیتا ہے۔

ساجد حمید: ساجد حمید کے شعری مجموعوں میں '' یادوں کے شہاب''۔ '' نفی ضرب نفی'' اور '' نکہت رقصاں'' پڑھیے۔ ساجد حمید کے شاعری کے رنگ قوسِ قزح کی صورت میں سامنے آئیں گے۔ انھوں نے غمِ زمانہ میں غمِ ذات کی آمیزش سے اپنی شاعری کے تانے بانے بنے ہیں۔ سائنسی ایجادات اور

صنعتی ترقیات سے آج کی زندگی کے لیے جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں، ساجد حمید نے ان مسائل کی سمت توجہ دی ہے۔ ان کے ہاں ذات کا کرب بھی ہے اور اپنے عہد کا خلفشار بھی۔ مختصر نظمیں بھی انھوں نے خوب کہی ہیں۔ نظم تضاد ملاحظہ ہو:

ہوا چل رہی ہے/ ابھر گا رہے ہیں/ میرے اندر/ کوئی رو رہا ہے

اور نظم ''مقدر'' سنیے:

دریچے کھول رکھے ہیں/ ہر ایک سورج آن ہے مگر!/ پھر بھی/ مرے چھوٹے سے کمرے میں

گھٹن اور تیرگی کی حکمرانی ہے

تنہا تماپوری: تنہا تماپوری کو غزل پر بھی اتنا ہی قابو ہے جتنا نظم پر۔ ان کا فن روایت اور جدیدیت کا متوازن امتزاج ہے۔ زبان و بیان اور فن پر ان کو بے پناہ قدرت حاصل ہے اور اپنے قلم پر اعتماد۔ انھوں نے اپنی آنکھیں کھلی رکھی ہیں۔ ان کی شاعری میں تخیل کم اور حقیقت کی کارفرمائی زیادہ ہے۔ انداز بیان کی ندرت سے بھی ان کے کلام پر جلا آتی ہے۔ انھوں نے زندگی کے کئی رخوں کو اپنے کلام کے کیمرے میں قید کرلیا ہے۔ نظم ''پھر وہی خواب'' ملاحظہ ہو:

اک روز سو کے اٹھوں/ اور صبح مسکرائے/ چہروں کے پھول دیکھوں/ مسکی ہوئی ہوں راہیں/ سانسوں کے زیر و بم میں/ سنگیت ہو خوشی کا/ بچوں کے قہقہوں کی کلیاں چٹک رہی ہوں/

گلیوں میں گھر کے بوڑھے/ بوڑھی کہانیوں کے دامن سے کھیلتے ہوں/ آنگن میں ہر پڑوسن/

دکھ کے دیوں میں سکھ کا کچھ تیل ڈالتی ہو/ ۔۔۔۔۔ حیرت ہے/ آج بھی میں/ کیوں خواب دیکھتا ہوں۔

رفعت ملک: رفعت ملک ہر چند کہ مسائلی شاعر ہیں۔ انھوں نے سیاسی موضوعات کو اختیار نہیں کیا لیکن انھوں نے معاشرتی مسائل پر گہری نظر ڈالی ہے۔ زندگی آج جن پیچ و خم سے گزر رہی ہے ان پر رفعت ملک کی نگاہ ہے، ان سارے خلفشار، الجھنوں، پریشانیوں، موانعات اور استحصال کی زد میں یہ انسان اور اس کی کائنات کیا کرے؟ ایک سوالیہ نشان ہے۔ رفعت ملک نے اس بے بسی کی نہایت خوبصورتی اور فنکاری کے ساتھ تصویر کشی کی ہے۔ وہ نثری نظم کے شاعر ہیں اور نثری شاعری کی ساری لطافتوں کے حامل۔ کرکٹ میچ جیسی نظم پڑھیے۔

دنیا کرکٹ گراؤنڈ/ اور میں/ اس کا کھلاڑی/ بولنگ کرتا ہے وقت/ حادثوں کی گیند سے/

اور پھر/ وقت کے عفریت نے/ ۔۔۔ موت نے شیطان نے/ ہر طرف سے گھیر رکھا ہے/

ہر حال میں آؤٹ کرنے کے لیے

جلیل تنویر: کرناٹک کے جن شاعروں نے نثری شاعری کی طرف توجہ دی ان میں جلیل تنویر کا نام بھی امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات عرض کرتی چلوں کہ صنفِ سخن کی اہمیت کے باوجود صرف صنف کی بنیاد پر کسی شاعر کے اچھے ہونے نہ ہونے اور چھوٹے یا بڑے ہونے کے حق میں رائے نہیں دی جاسکتی۔ رفعت ملک اور جلیل تنویر کے بارے میں بھی یہی کہنا ہے کہ وہ اس لیے قابل توجہ شاعر نہیں کہ انھوں نے شاعری کی بلکہ انھوں نے اپنے آس پاس کے مسائل کو ذہن میں رکھا۔ نظم ''سوال'' کے آخری مصرعے:

میں انسانوں سے نہیں/ دیویوں، دیوتاؤں اور خداؤں سے پوچھتا ہوں/ بتاؤ تم کچھ دیکھتے ہو/

اپنے ہی بندوں کے لہو کو/ اس طرح ارزانی سے بہتے ہوئے/ اے دیویو، دیوتاؤں اور خداؤ/

تم ہی بتاؤ/ تم ہی بتاؤ

حامد اکمل: حامد اکمل زندگی سے ہمیشہ نبرد آزما رہے ہیں۔ کبھی جیت ہوئی ہے کبھی ہار بھی، وہ ہار کر بھی جیت جاتے ہیں کہ زندگی کے موسم ان پر روشن ہوئے ہیں اور وہ زندگی کی ہزار صعوبتوں کے باوجود دل شاد اور مطمئن رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حامد اکمل کے اشعار میں رجائیت کارفرما رہی ہے۔ انھوں نے غزلیں کہی ہوں یا نظمیں زندگی بہ ہزار شیوہ ان کے کلام میں جیتی جاگتی ہے۔ ان کے مجموعہ کلام ''تشبیہ'' سے دو ایک نظمیں:

یاد رکھیں

۔۔۔۔۔/ چلو، اب سوچنا بھی چھوڑ دیں/ زندگی جینے کی خاطر/

فکر سے دامن بچائیں/ کسی کو بھولنا ہے یاد رکھیں

بصیرت

کئی نادیدہ غم جگاتی ہے/ کئی نادیدہ خواہشوں میں پھنساتی ہے/

بصارت سے زیادہ/ زخم دیتی ہے

سید شاہ مدار عقیل: غزل کی روایتی تام جھام سے تو سب نباہ کرلیتے ہیں لیکن نظم نگاری سے انصاف اتنا آسان نہیں۔ موضوع، تسلسل بیان ارتکاز فکر اور مجموعی تاثر، ان سب کا حق ادا کرنا۔ بہت کم حق ادا کرتے ہیں۔ سید شاہ مدار عقیل ان شاعروں میں ہیں جنھوں نے غزلیں بھی اچھی کہی ہیں اور نظمیں بھی۔ انھوں نے اور کچھ نہیں کیا زندگی کی حقیقتوں کو بے نقاب کردیا ہے۔ یہ ہنر بہت کمیاب ہے اور پھر جہاں کہیں طنز سے کام لیا ہے شراب دو آتشہ ہوگئی ہے۔ اس نظم کا عنوان ہی ''نظم'' ہے۔ دیکھیے کتنی تلخ بات کس قرینے سے کہی گئی ہے۔

شہر میں روشنی کا ہے اچھا انتظام/ شاہراہیں، گلی کوچے/ اس شہر کے/ ہم

نے دیکھے سدا/ روشنی میں نہائے ہوئے/ اینٹ پتھر کی اک ایک بلڈنگ کو/ تار کو، سڑک اور چوراہے کو/ روشنی بخشنے میں ہوئے کامیاب/ قائدِ قوم یا شہر کے رہنما/ روشنی گھر کے دروازے تک آ گئی/

دل کے دروازے کا راستہ نہ ملا/ دل اندھیرے میں تھے، دل اندھیرے میں ہیں

شائستہ یوسف: شائستہ یوسف نے اپنے شعری رویے اور اسلوب کی وجہ سے قارئین کو جلد ہی اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ کنایوں، استعاروں، علامتوں اور اشاروں میں بات کرتی ہیں۔ اردو میں نسائی تحریک ابھی ایسی پھولی پھلی نہیں ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہر وہ خاتون جو شاعری کرتی ہو نسائی ادب میں اس کا حصہ ہو جب کہ بعض مردوں نے بھی نسائی تحریک میں اپنا حصہ ادا کیا ہے۔ عورتوں کے استحصال پر احتجاج کرتے ہوئے، شائستہ یوسف کے یہاں نسائی تحریک کے اثرات ملتے ہیں۔ انھوں نے استعاروں اور اشاروں سے کام لیتے ہوئے عورتوں کے معاشرتی حالات پر معاشرے کو متوجہ کیا ہے۔ ان کے حق میں آواز بلند کی ہے۔ ان کی نظم "سب بہرے تھے" کے آخری مصرعے ملاحظہ ہوں:

آگ کے دریا سے گزر جانے کا کھیل/ آج تک/ میری معاش کا سہارا بنا رہا/ لیکن جس دن/ میں نے جینا چاہا/ تو آگ کے حلقے سے/ نکلنے تک/ سارا بدن جھلس گیا

خالد سعید: خالد سعید نے غزلیں بھی اپنے انداز کی کہی ہیں، لیکن ان کی نظمیں بھی جادو جگاتی ہیں۔ ارتکازِ فکر اور تسلسلِ خیال کا وہ کما حقہ لحاظ کرتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک تیکھا پن ہے جو زمانے کی سرد مہری اور زندگی کی بے توجہی کا ردِ عمل بھی ہوسکتا ہے۔ خالد سعید نے جدید رجحانات کو اختیار کیا ہے لیکن جدیدیت کی بے راہ روی سے دور ہوتے ہوئے شعر و ادب کی صحت مند قدروں سے اپنے فن کو اجال دیا ہے۔ زبان و بیان کی نزاکتوں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے فنی ریاض بھی کیا ہے۔ "درندہ پچھلی ساعت کا"، "پیاس آشفتہ"، "کھل جانے کے بعد"، "تشنگی" اور "ہم کہ اکھڑے ہوئے پیڑ سمجھے گئے"۔ نظم "درندہ پچھلی ساعت کا" کے آخری مصرعے:

میری سانسوں کے شاخوں پہ بیٹھے ہوئے تشنگی کے پرندے اڑے
اپنی منقار بھر پیاس کے واسطے/ مگر۔۔۔ آسمانوں میں بھی کوئی قطرہ نہیں
اور سمندر سراب
ایک بے بوند دل ہے کہ تلتا نہیں/ شب ڈھلکتی نہیں، دن سرکتا نہیں

رزاق افسر: رزاق افسر صرف جذبات و احساسات کا اظہار نہیں کرتے بلکہ اپنی فکر میں انھیں تپاتے بھی ہیں، زندگی کی کڑی حقیقتوں کا انھوں نے ادراک و تجزیہ کیا ہے تب کہیں اپنی شاعری میں پیش کیا ہے، ان کے یہاں ایک دردمندی ہے، انسان دوستی بھی ان کی نظموں میں تاثیر اور دلآویزی پیدا کر دیتی ہے۔ علی گڑھ کے فسادات اور اسی دوران جانوروں کی حفاظت کا بین الاقوامی سال۔۔۔ کے پس منظر میں ان کی نظم "فرق" پڑھیے۔/ تختیاں، جنگل کی سرحد پر لگی ہیں/ جن میں سرخی سے لکھا ہے، انتباہ!/ ہر درندہ، ہر چرندہ، کل پرندے/ جو بھی اس جنگل میں ہیں آباد وہ/ سب کے سب ہیں ملک اب سرکار کی/ جرم ہے ان میں کسی کا بھی شکار/ اور حفاظت لازمی/ ان سب کی خاص و عام پر/ معاملہ برعکس اس کے/ شہر و بستی میں کہیں بھی/ ٹوکنے والی کوئی تختی نہیں/ صبحِ زہرابِ فنا/ شام ہے رقصِ اجل/ ٹھیک ہے/ جنگل و بستی میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے

شیدا رومانی: شیدا رومانی کم کہتے ہیں لیکن خوب کہتے ہیں، ان کی غزلوں میں بھی وہی دلنوازی ہے جو نظموں میں ہے۔ "درد کا سورج" میں مشمولہ نظموں سے ظاہر ہوگا کہ جہاں انھوں نے حب الوطنی کے گیت گائے ہیں وہیں معاشرے کے کمزور پہلوؤں اور حالات کی ستم ظریفیوں کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان کی کئی منظومات پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ جیسے "شب دل"، "دخترِ فکر"، "پتھروں کے شہر میں"، "خلیج، لمحۂ احتیاط"، "سرابوں کا سفر"، "رت جگا" اور حب الوطنی کے موضوع پر نظمیں:۔ "ایک ہم ہیں ہمارا وطن ایک ہے"، "پیامِ یکجہتی"، "امن کا گیت"، "صبحِ نو" اور "میرا ہندوستان" وغیرہ۔ نظم "بے یار و مددگار" ملاحظہ فرمائیں:

نہ کوئی پھول نہ پتہ نہ کوئی کونپل ہے/ خزاں کی ماری ہوئی ایک۔۔۔ سوکھی ٹہنی پر/ کسی کے اجڑے ہوئے آشیاں کے تنکے ہیں/ نہ جانے کس کا بسیرا تھا کون پنچھی تھا/ تلاشِ یار میں شاید بھٹک رہا ہوگا/ مری ہی طرح اکیلا سسک رہا ہوگا۔

حسنیٰ سرور: حسنیٰ سرور نظم نگار کی حیثیت سے بھی اپنا مقام رکھتی ہیں، درد و غم ان کی شاعری کا عنوان ہے۔ غالباً زمانے نے انھیں دیا بھی یہی ہے اور یہی وہ لوٹا بھی رہی ہیں۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی لیکن ان کی نثری نظمیں متوجہ کن ہی نہیں وقیع اور گرانمایہ بھی ہے۔ اسی درد و غم کی آئینہ دار، کرب و بلا کی حامل ان کی نثری نظم "زندگی کا ایک حصہ" دیکھیں:

زندگی

نہ بادِ صبا کا جھونکا ہے/ نہ خوشبو کا لمس/ اور نہ ہی کھلتی کلیوں کا تبسم/
زندگی۔۔۔۔!؟/ کرب و آزار کا/ رستا ہوا ناسور ہے

موت کے نام سے/ موت کے ذکر سے/ لوگ ڈرتے ہیں/ لیکن مجھے اب/ زندگی کے نام سے خوف آنے لگا ہے/ کہ/ صبح سے شام کرنا/ شام سے صبح/ ہے اک عذابِ عظیم/ جانے اور کب تک/ اسے جھیلنا ہے/ جانے کب تک/

ریاض احمد خمار: ریاض احمد خمار کا فن ان کی نظموں میں کھلتا ہے، جس میں وہ حب الوطنی کے گیت گاتے ہیں۔ اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی

انھیں خوب آتی ہے۔ ''اوج آزادی'' اور مزدور کی عید'' جیسی نظمیں انھوں نے تخلیق کی ہیں۔

کوثر جعفری بھٹکلی: کوثر جعفری بھٹکلی کے یہاں بھی حب الوطنی کے جذبات بے پایاں، بے کراں ہیں، وہ ہموطنوں کی بے بسی، افلاس، وفاداری اور بے نوری پر تلملا اٹھتے ہیں۔ ان کے ہاں روانی بے پناہ ہے۔ ان کی چند نظمیں بے حد پر تاثیر ہیں جیسے ''نوجوانوں سے خطاب''۔ ''غریب الوطن کی عید'' اور ''تحفۂ عید''۔

وزیر عرشی: وزیر عرشی کے مجموعۂ کلام ''نقوشِ عرشی'' میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ نظم ''جاں نثار اختر کی موت پر'' متاثر کرتی ہے۔

کرناٹک میں اردو نظم گو شاعروں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ہمارے یہاں کئی صفِ اول کے شاعر ہیں۔ ان سارے شاعروں کے کلام کا جائزہ کسی ضخیم کتاب کا موضوع بن سکتا ہے۔ پھر بھی شاید تشنگی محسوس ہو۔ ایک پروجیکٹ کے طور پر اس موضوع پر کام کیا جائے تو ممکنہ حد تک بہتر نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے۔ ان چند صفحات سے کرناٹک میں اردو نظم کے خدوخال سامنے آجاتے ہیں۔ ایک ایسی تصویر ضرور ابھر آتی ہے جو نظم کے نگار خانے میں آنے والوں کو متوجہ کرتی رہے گی۔

(بشکریہ: سب رس، حیدرآباد)

نشاطِ روح

شاعر: اصغر گونڈوی

اصغر گونڈوی کے مجموعۂ کلام ''نشاطِ روح'' (مرتب: مرزا احسان احمد) کی پہلی اشاعت 1925 میں مطبع معارف اعظم گڑھ سے اور دوسری اشاعت (مرتب: اقبال احمد سہیل) 1982 میں اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ سے عمل میں آئی تھی۔ اقبال احمد سہیل نے اس مجموعے کو بڑی دیدہ ریزی سے مرتب کیا ہے۔ مرزا احسان احمد کے دیباچے اور مقدمے کے بعد انھوں نے ''تبصرہ'' کے عنوان سے اصغر گونڈوی کی شاعری کا مبسوط محاکمہ کیا ہے اور ان کی شاعری کے محاسن کو موسیقی، بت تراشی، ایجاد و تخلیق، مصوری اور اسرار و معارف کے الگ الگ عنوانات سے سمجھنے کی کوشش کے بعد آخر میں اصغر گونڈوی کا کلام شامل کیا ہے۔ اصغر گونڈوی کی غزلوں کی ہمہ گیری اور اثر انگیزی کے مطالعے کے لیے اس نسخے کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے اس کا تازہ ایڈیشن شائع کیا ہے۔

صفحات: 73، قیمت: -/49 روپے

ڈیوڈ کاپر فیلڈ (جلد اول)

مصنف: چارلس ڈکنس/ مترجم: فضلِ حسنین

چارلس ڈکنس کی تحریر کی دلربائی اور اس کے اسلوب کی رعنائی کو اپنے ترجمے میں کشید کرنے میں فاضل مترجم نے کتنا وقت صرف کیا ہوگا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس ترجمے کی ہر سطر میں پھولوں کی وہی خوشبو بسی ہوئی ہے جس سے چارلس ڈکنس کی انشا پردازی کا چمنستان مہکتا تھا۔

اسے ترجمہ نہیں، اصل ناول کا عکسِ جمیل کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

ڈیڑھ سو برس قبل انگریزی میں لکھے گئے اس شہرۂ آفاق ناول کا پہلی مرتبہ اردو ترجمہ پیش کرنے کا شرف ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' کو حاصل ہے۔

صفحات: 516، قیمت: -/256 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

گلزار دہلوی

علامہ دتاتریہ کیفی دہلوی

● اس سال دلّی اردو اکادمی نے پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی کو علامہ دتاتریہ کیفی ایوارڈ پیش کیا ہے۔ اس مناسبت سے امید ہے یہ مختصر مضمون، جو گلزار صاحب نے کچھ دن پہلے ہی ہمیں ارسال کیا تھا، خصوصی دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ ادارہ

غم رہا ان کا جو دوزخ میں پڑے جلتے ہیں
میرے خوش ہونے کا جنت میں بھی ساماں نہ ہوا
(علامہ کیفی دہلوی)

دلّی کو جن اساتذۂ علم وفن پر ناز ہے، ان میں خاص طور پر مندرجۂ ذیل حضرات قابلِ ذکر ہیں: رائے بہادر پنڈت جانکی ناتھ مدن بیخان دہلوی، رائے تربھون ناتھ ہجر، جواہر ناتھ کول غمخوار ساقی، پنڈت امرناتھ مدن ساحر، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی، پنڈت برج کشور زتشی شور اور پنڈت تربھون ناتھ زار زتشی۔

مندرجۂ بالا آخری چاروں اساتذہ سے میرا خاندانی تعلق ہے اور خون کا رشتہ ہے۔ ساحر صاحب اور کیفی صاحب میرے چچا، شور صاحب میرے ماموں اور زار دہلوی میرے والد تھے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کے معماروں میں سرراس مسعود، سرتیج بہادر سپرو، بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، علامہ پنڈت دتاتریہ کیفی، ہاشمی فرید آبادی، سید مطلبی اور تقسیم وطن اور آزادی ملک کے بعد، قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر آل احمد سرور، پنڈت ہردے ناتھ کنزرو، پنڈت آنند نرائن ملا، سید حامد اور کرنل بشیر حسین زیدی کے نام نامی قابلِ ذکر ہیں۔

مولوی عبدالحق اور علامہ کیفی دونوں حبیب لبیب، ایک دوسرے کے نفسِ ناطقہ تھے، ساری زندگی اردو زبان اور انجمن کی خدمت میں گزار دی۔ خصوصاً 1937 سے 1955، تک دس سال آزادی سے پہلے اور آٹھ سال آزادی کے بعد (ہندوستان کے دو ٹکڑوں میں بٹ جانے کے باوجود)، انجمن "قومی زبان" اور "ہماری زبان" اور اردو تحریک کے محافظ و معمارِ اعظم رہے۔

کیفی صاحب 1863 میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ آپ نے سرسید احمد خاں، حالی، شبلی، داغ، امیر مینائی الور، ظہیر، میر مہدی مجروح، ڈپٹی نذیر احمد، امام بخش صہبائی کا آخری دور بھی دیکھا۔

کیفی صاحب مشرقی تہذیب اور مغربی تمدن کے متوازن، روشن پیکر تھے۔ آپ 16-1915 میں یورپ کے دورے پر تشریف لے گئے اور وہاں بھی حب الوطنی سے پُر، اپنی نظموں اور جوشیلی تقریروں سے اہلِ علم کو متوجہ کیا۔

فرخ سیر کے عہد میں آپ کے اجداد کشمیر سے دلّی آکر آباد ہو گئے تھے۔ دیگر پنڈت صاحبان کے قدیم خاندانوں کی طرح کیفی صاحب کے اجداد بھی اور خود علامہ کیفی، فارسی، انگریزی، سنسکرت اور عربی سے واقف تھے۔ ان کے اجداد بازار سیتارام میں آباد ہوئے تھے جہاں کشمیری پنڈتوں کے خاندان پہلے سے سکونت پذیر تھے۔ کیفی صاحب 1948 کے بعد، 17۔علی پور روڈ پر منتقل ہو گئے تھے۔ کیفی صاحب نے حکیم بوریے والے (بازار سیتارام) کے مدرسے میں ابتدائی تعلیم پائی۔ مکتب کے بعد سینٹ اسٹیفن کالج میں حصول علم کیا۔ جلد ہی مولانا محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی سے شرف تلمذ حاصل ہوا اور غزل سے ہٹ کر نظم کی طرف مائل ہوئے۔

آپ کا مجموعۂ کلام "واردات" کے نام سے شائع ہوا جو بہت ضخیم ہونے کے باوجود، بہت مقبول ہوا۔ آپ نے افسانہ، ڈراما، مثنوی اور تنقید بھی لکھی۔ "منشورات" آپ کے مقالوں اور تقاریر کا مجموعہ ہے جو اردو دنیا میں تحقیق کا سنگِ میل سمجھا جاتا ہے۔ ساری زندگی کا نچوڑ ان کی تصنیف "کیفیہ" ہے جس میں تحقیق، قواعد، عروض اور لسانیات پر عالمانہ مباحث ہیں۔ "بھارت درپن"، "خمخانۂ کیفی"، "پریم ترنگنی"، "شوکت ہند"، "توزک قیصری"، (شاعری میں) اور نثر میں "عورت اور اس کی تعلیم"، "چراغ ہدایت"، "پریم دیوی"، "نبھتا رانا" (ناول)، "راج دلاری" اور "مراری دادا" (ڈرامے)، اور "آخری چند نظمیں" 1920 سے 1952 تک شائع ہوئیں۔

آپ نے لکھنؤ، لاہور، حیدرآباد (دکن)، پٹنہ، بھوپال، رامپور، پشاور، کراچی کی متعدد یونیورسٹیوں میں ایکسٹینشن لکچر دیے۔ اپنے قیمتی خطوط، تصاویر اور ہزاروں کتابیں، تقسیم سے پہلے ہی لاہور یونیورسٹی پنجاب کو عطیہ کر دی تھیں۔

علامہ کیفی ایک مرنجاں مرنج، خوش اخلاق، وضعدار، اور خلیق انسان تھے لیکن نقد و نظر کے معاملے میں سخت گیر تھے۔ مجھے کیفی صاحب کی بدولت اردو، فارسی، انگریزی ادب کے علاوہ نصابات سے الگ مختلف موضوعات پر کتابیں پڑھنے کا ذوق پیدا ہوا۔ میری سیاسی، قومی، انقلابی اور باغیانہ نظمیں، جو

1936-1938 میں کہی گئیں میری والدہ شریمتی راج رانی زتشی بیزار دہلوی اور علامہ کیفی کی سرپرستی کا نتیجہ تھیں۔ پنڈت امرناتھ مدن ساحر دہلوی کی بزم سخن میں خواجہ محمد شفیع کی اردو مجلس میں اور انجمن ترقی اردو میں، بزم تیموری میں اور دلی کے اس دور کے تمام اسکولوں، کالجوں اور درسگاہوں میں مشہور اساتذہ کے ساتھ میں نے مشاعروں میں شرکت کی اس کا سبب بھی ساحر صاحب کیفی صاحب اور سائل صاحب تھے۔

ہندو مسلم اتحاد، مشترکہ تہذیب، متحدہ تمدن اور انسانی رواداری، علامہ کیفی میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ رہن سہن، کھانا پینا، گفتگو سب میں گنگا جمنی تہذیب کی جھلک تھی۔ مجھ میں اردو کے تحفظ کا جو جذبہ پیدا ہوا اس میں سب سے بڑا ہاتھ علامہ کیفی کا تھا جو 1948-1955 کے دور میں بھی میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔

کیفی صاحب آزادی سے بہت پہلے ریاست جموں و کشمیر میں فارن سکریٹری رہے، پھر ایک ریاست میں مجسٹریٹ اور کلکٹر رہے اور پھر ساری عمر کے لیے مولوی عبدالحق کے ساتھ انجمن ترقی اردو (ہند) کے ہو رہے۔ یہ تعلق 1936-37 سے 1955 تک جاری رہا۔ شاعری میں غزل، رباعی، قطعہ، مسدس، مخمس، طویل نظمیں، غرض ہر صنف سخن پر انھیں قدرت حاصل تھی، مگر نثر میں تحقیقی و تنقیدی کام، لسانیات اور قواعد وعروض پر اور اردو کی تاریخ پر جو بیش بہا کام انھوں نے کیے وہ ان کی شاعری پر چھا گئے۔

□□□

پتہ:
C-99, Sector-26,
Noida-201301 (U.P.)

گزارش

ماہنامہ "اردو دنیا" اور سہ ماہی "فکر و تحقیق" کے قلم کاروں سے گزارش ہے کہ وہ اپنی تخلیقات صاف، خوشخط یا کمپوز شدہ بھیجیں۔ تحریر گنجلک ہونے کی صورت میں اس کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا۔

فارم-4

(قانون 8 کے تحت)

"اردو دنیا" کے بارے میں تفصیل

1. اشاعت کی جگہ : نئی دہلی

2. اشاعت کا وقفہ : ماہنامہ

3. طابع کا نام : ایس نارائن اینڈ سنز
شہریت : ہندوستانی
پتہ : ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-20

4. ناشر کا نام : ڈاکٹر علی جاوید

5. ایڈیٹر کا نام : ڈاکٹر علی جاوید
شہریت : ہندوستانی
پتہ : ڈائرکٹر قومی اردو کونسل، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

6. ان لوگوں کے نام اور پتے جو پونجی کے ایک فیصد سے زیادہ کے شریک اور حصہ دار ہیں : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

میں ڈاکٹر علی جاوید، ڈائرکٹر قومی اردو کونسل یہ تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات بالکل درست اور صحیح ہیں۔

محمد خلیل

پروفیسر محمد شفیع — ایک معروف وممتاز جغرافیہ داں

گذشتہ سال 8 دسمبر کو پروفیسر محمد شفیع، جو ایک مشہور و معروف جغرافیہ داں تھے، 85 سال کی عمر میں علی گڑھ میں رحلت کر گئے۔ مرحوم کی پیدائش ایک زمیندار گھرانے میں یکم اگست 1924 جونپور (یوپی) میں ہوئی تھی۔ پروفیسر شفیع علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ جغرافیہ سے 1948 میں وابستہ ہوئے اور یہ وابستگی طویل عرصے تک رہی۔ وہ شعبے کے صدر بھی رہے۔ انھوں نے لندن یونیورسٹی سے جغرافیہ میں پی ایچ ڈی کی تھی۔ ان کے تحقیقی مقالے کا موضوع مشرقی یوپی میں زرعی زمین کا صحیح استعمال تھا۔ ان کے تحقیقی مقالے کو ملک و بیرونی ممالک میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ جغرافیہ کی تحقیق و تدریس کے کاموں کے ساتھ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر، وائس چانسلر اور بعد میں پرو چانسلر بھی بنائے گئے۔ آپ کو عالمی جغرافیائی یونین کا دو بار صدر بھی بننے کا اعزاز حاصل رہا۔ برائے سال 88-1984 اور 92-1988 جس میں تقریباً چار ہزار ماہرین شرکت کرتے ہیں، یہ ایک بڑا اعزاز تھا۔ وہ مسلم یونیورسٹی کے اکیڈمک پروگرام کے ڈائرکٹر اور سائنس فیکلٹی کے ڈین بھی رہے۔

ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی مقالے پر مبنی کتاب ''مشرقی یوپی میں زمین کا استعمال'' نے زرعی جغرافیہ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے مشرقی اترپردیش کی زراعت کا جائزہ لیتے ہوئے تقریباً بارہ خود کفیل دیہی علاقوں کا تحقیقی سروے کیا تھا۔ انھوں نے ہر گاؤں کی زرعی زمین کی پیداواری صلاحیت معلوم کی، اس کو عالمی معیار پر کیلیریز میں تبدیل کیا اور گاؤں کی آبادی سے اس کا تغذیاتی (غذائی فراہمی) رشتہ معلوم کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ جن گانوؤں میں کیلیریز کی دستیابی فی کس فی دن 2 ہزار یا اس سے زیادہ ہے، وہ لوگ نسبتاً صحت مند ہیں اور جہاں دستیابی دو ہزار کیلیریز سے کم ہے وہاں طرح طرح کی بیماریاں تغذیے کی کمی یا خرابی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس تحقیقی مطالعے میں ڈاکٹر شفیع نے ایک اصول دریافت کیا کہ ایک ایکڑ زمین جو زرخیز ہو، آب پاشی کی سہولتیں موجود ہوں اور دوسری سہولتیں بھی ہوں تو اس سے ایک شخص کو اتنا تغذیہ مل سکتا ہے جو اس کو پورے سال صحت مند رکھنے میں کفیل ہوگا۔

زمین کے منصوبے کے سلسلے میں ڈاکٹر شفیع نے زرعی زمین کے کلاسفکیشن پر زور دیا اور کہا کہ زمین کی تقسیم اس کی زرخیزی اور پیداواری صلاحیت کی بنا پر کی جائے اور اگر یہ تقسیم تین طرح کی زمین الف، ب اور ج ہے اور الف کی زرخیزی ب کے مقابلے میں دو ہے اور ب کی الف ہے اور ج کی ب کے مقابلے میں نصف ہے تو اگر ایک مل (کارخانہ) کے لیے ایک ہزار ایکڑ زمین کی ضرورت ہے اور ب زمین لی گئی تو ہر اعتبار سے وہ ایک ہزار ایکڑ لی گئی لیکن درحقیقت دو ہزار ایکڑ لی گئی اور اگر ج قسم کی زمین لی گئی تو درحقیقت صرف پانچ سو ایکڑ زمین لی گئی کیونکہ اس کی زرخیزی ب زمین کے مقابلے میں نصف ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر محمد شفیع نے اس بات پر زور دیا ہے کہ زمین جو قوم کا اول و آخر سرمایہ ہے، اس کی تقسیم مذکورہ اصولوں پر کرنے کے بعد ان کے نقشے تیار کیے جائیں اور الف قسم کی زمین کو صرف زراعت کے لیے مخصوص کر دینا چاہیے۔

ڈاکٹر محمد شفیع نے زرعی پیداوار کے معیار کو جانچنے کے زاویے متعین کیے ہیں اور زرعی جغرافیہ میں تحقیق کا ایک نیا معیار قائم کیا ہے۔ جرمن جغرافیہ داں بھنون کے اصول کے مطابق جیسے جیسے بازار سے دوری ہوتی جاتی ہے زمین کی کاشت کی صلاحیت میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ اس اصول کی روشنی میں اپنے گاؤں کے تحقیقی جائزے کے بعد ڈاکٹر محمد شفیع نے ایک نیا اصول مرتب کیا کہ ہندوستان میں زمین کی کاشت کی صلاحیت کا انحصار آب پاشی سے نزدیکی ہے، خواہ وہ زمین بازار سے کتنی ہی دور ہو۔ اس طرح انھوں نے زرعی پیداوار میں نظام (سسٹم) کے تعلق پر بڑا زور دیا ہے۔ اس کو یوں سمجھیے کہ انسان کے جسم میں مختلف اعضا مختلف کام انجام دیتے ہیں لیکن ان سب کا مقصد انسان کی صحت کو قائم رکھنا ہے، اگر اگر کسی ایک کے کام میں فرق آتا ہے تو پورے جسم کی صحت کو نقصان پہنچتا ہے۔ چنانچہ کاشت کے پہلے کے جتنے مراحل ہیں اور فصل کے تیار ہونے کے بعد کے جو مراحل ہیں ان سب کو علاحدہ علاحدہ نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ ایک ساتھ دیکھنا چاہیے۔ ڈاکٹر محمد شفیع کے گراں قدر تحقیقی کام کو دیکھتے ہوئے بین الاقوامی جغرافیائی یونین نے خوراک کے سسٹم کی تحقیق کے لیے ایک عالمی کمیشن کی تشکیل کی اور آپ کو اس کا چیئرمین مقرر کیا گیا۔ اس سے عالمی سطح پر ان کے جغرافیائی تحقیقی معیار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

عالمی کلچرل کاؤنسل نے جس کا صدر مقام میکسیکو ہے، ڈاکٹر محمد شفیع کو ایک اعزازی ڈپلوما ان کے اہم تحقیقی جغرافیائی کام پر عطا کیا تھا۔ آپ کو لندن کی رائل جغرافیائی سوسائٹی نے کاؤنسل کا اعزازی ممبر مقرر کیا تھا۔ جغرافیہ کے میدان میں یہ اعزاز کسی ہندوستانی کو پہلی بار ملا تھا۔ آپ کی تحقیقی کوششوں کا

اعتراف کرتے ہوئے ماسکو کی ''روسی اکیڈمی آف سائنس'' کے جغرافیائی انسٹی ٹیوٹ نے آپ کو اپنا بیرونی اعزازی ممبر مقرر کیا اور اپنے سب سے بڑے اعزاز اکیڈمیشین سے نوازا تھا۔ یورپ کی کئی یونیورسٹیوں نے آپ کو اعزازی تمغے عطا کیے تھے۔ امریکہ نے بھی اپنی جغرافیائی سوسائٹی کا آپ کو فیلو بنایا۔ اقوام متحدہ کی باڈی اسکیپ نے آپ کی خدمات خوراک کی منصوبہ بندی کے سلسلے میں حاصل کیں۔ آپ کو یوگینڈا (افریقہ) کی مشہور یونیورسٹی میکریرے نے یونیورسٹی کے سالانہ کنووکیشن کو خطاب کرنے کے لیے مدعو کیا اور وہاں آپ کے خطبے ''تعلیم کی گوناگوں وسعت'' کو بے حد سراہا گیا۔ وہ انڈین نیشنل سائنس اکادمی (انسا) کی بین الاقوامی تنظیم کے صدر بھی رہے۔ نیز ہندوستان کی جغرافیائی کونسل ناگی (قومی جغرافیائی تنظیم) کے صدر بھی رہے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے انھیں جغرافیہ کے موضوعات پر ملک میں قومی خطبات دینے کے لیے آپ کی خدمات حاصل کیں۔ یونیسکو نے ان کے ایک اہم مضمون پر (امان جارڈن) میں انھیں مدعو کرکے انعام سے نوازا تھا۔ یونیسکو نے آپ کو انٹرنیشنل سوشل سائنس کاؤنسل کی سائنس کمیٹی کا ممبر بھی پیرس کی منعقدہ کمیٹی میں نامزد کیا تھا۔ عالمی جغرافیائی یونین نے گلیسیلکو (برطانیہ) میں منعقدہ اس تنیسویں کانفرنس میں ڈاکٹر محمد شفیع کو جغرافیائی تحقیقی خدمات پر ''لاریٹ آف آنر'' کے اعزاز سے نوازا تھا۔ وہ پہلے ہندوستانی جغرافیہ داں تھے جنھے اس اعزاز سے نوازا گیا تھا۔ وہ مسلسل 1964 سے زندگی کے آخری برسوں تک عالمی جغرافیائی کانفرنس میں کسی نہ کسی سیکشن کی صدارت کرتے رہے۔ یہ کانفرنسیں لندن، کنگسٹن (امریکہ)، میکسیکو، پیرس، ٹوکیو (جاپان)، کناڈا، فرانس، بوڈاپیسٹ (ہنگری)، لیگ (نیدرلینڈ)، ٹورنٹو (امریکہ)، ارکا جو (برازیل) اور بیجنگ (چین) میں منعقد ہوئیں تھیں۔ اس طرح ڈاکٹر محمد شفیع تقریباً ساٹھ سال تک ایک معروف عالمی شہرت یافتہ جغرافیہ داں کی حیثیت سے علمی دنیا کی اونچائیوں پر جلوہ گر رہے۔

بھارت سرکار نے بھی انھیں ان علمی تحقیقی خدمات کے لیے 2001 میں ''پدم شری'' اعزاز سے نوازا تھا۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے 2002 میں انھیں ماحولیاتی خدمات کے لیے ''سروتی سمان'' عطا کیا تھا۔ پوروانچل یونیورسٹی نے انھیں ''پوروانچل رتن'' کے خطاب سے 2003 میں نوازا تھا۔ حیدرآباد کے زمینی تحقیقی مطالعے کے مرکز نے ان کی خدمات کے لیے انھیں ''کملا'' ایوارڈ پیش کیا تھا۔ ڈاکٹر محمد شفیع کی جغرافیہ پر چودہ کتابیں ہیں اور تحقیقی مقالوں کی تعداد ایک سو چالیس ہے۔ آپ کی نگرانی میں تقریباً چونتیس لوگوں نے پی ایچ ڈی کی جو آج ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

یہاں یہ ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر محمد شفیع کو اردو زبان سے بڑی دلچسپی تھی وہ اردو زبان میں سائنسی موضوعات پر پابندی سے لکھتے رہے ہیں۔ آپ کے مضامین ملک کے مختلف اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوئے۔ خاص طور پر رسالہ ''سائنس کی دنیا''، ''آواز'' اور ''افکار'' میں شائع ہوئے ہیں۔ آپ کی مشہور کتاب ''زرعی جغرافیہ'' کو ترقی اردو بورڈ نئی دہلی (این سی پی یو ایل) شائع کر چکی ہے جو اردو حلقوں میں بے حد مقبول ہوئی۔ اس کتاب کو یو پی اردو آبادی نے اپنے ایوارڈ سے نوازا تھا۔ آپ کے مضامین آکاش وانی سے نشر ہوتے رہے ہیں۔ بی بی سے اردو سروس سے بھی انٹرویو نشر ہوئے ہیں۔ آپ ترقی اردو بورڈ کے مشاورتی پینل میں رہے۔ اس کے ساتھ ہی جغرافیہ پینل اور ترقی اردو بورڈ کے جغرافیہ ٹرمینالوجی کمیٹی کے بھی چیئرمین رہے۔ جامعہ اردو علی گڑھ کی ایکزیکٹیو کمیٹی کے ممبر بھی رہے۔ اردو رسالہ ''فکر و نظر'' کے مشاورتی بورڈ کے بھی ممبر رہے۔ مرحوم ایک لائق استاد بہترین منتظم اور عالمی شہرت یافتہ جغرافیہ داں و سائنس داں ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد خوش اخلاق تھے۔ ان کی موت نے جغرافیہ کے میدان میں ایک خلا پیدا کر دیا ہے۔

□□□

پتہ:
H51 DR Iqbal Lane,
Batla House,Jamia Nagar,
New Delhi-110025

اتحاد سے انتشار کی طرف

مصنف: پروفیسر مشیر الحسن

اودھ کی گم ہوتی ہوئی قصباتی تہذیب اس ہند ایرانی ثقافتی ورثے کی امین رہی ہے جو ہمارے صدیوں کے ثقافتی میل جول کی دین تھا۔ پروفیسر مشیر الحسن کی یہ کتاب جو ایک مورخ کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے مختلف مذہبی فرقوں کے ان باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے جو کثرت میں وحدت کی آئینہ داری کرتے تھے۔ قصبات کی روزمرہ کی زندگی رسم و رواج، سماجی اور مذہبی تقریبات، ان سب چیزوں کا ایسا دانشورانہ بیان جو دلچسپ بھی ہے اور خیال انگیز بھی۔

صفحات: 415، قیمت: -/216 روپے

شمیم احمد صدیقی

ایڈز کا عارضہ اور ہماری ذمے داریاں

گذشتہ صدی کی سائنسی ترقیات نے انسان کو راحت و آرام، آمد و رفت اور پیغام رسانی کے حیرت انگیز سامان مہیا کرانے کے ساتھ ساتھ مادہ پرستی، عیش کوشی اور آخرت سے غفلت کے جذبات کو بھی فروغ دیا ہے۔ مختصر مدت میں دُنیاوی عروج حاصل کرنے اور ہر ممکن طریقے سے کاروبار کو فروغ دینے کی فکر نے بیسویں صدی میں ایسے گھناؤنے طریقوں کو جنم دیا جو پہلے سوچے بھی نہیں جاسکتے تھے۔ مثلاً فیشن کے نام پر ایسے ملبوسات کو فروغ دیا گیا جو صنف نازک کو زیادہ سے زیادہ عریاں کرکے دکھاسکیں۔ زیبائش کی مصنوعات کا بازار گرم کرنے کے لیے حسینۂ ملک، حسینۂ عالم اور حسینۂ کائنات جیسے دلکش ناموں سے ایسے فیشن شو ترتیب دیے گئے جن میں دوشیزاؤں کو برائے نام کپڑوں میں دُنیا والوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ کاروباری طبقے کی دل بستگی کے لیے بڑے بڑے ہوٹلوں میں جنسی بازار گرم کیے گئے۔ اسی کے ساتھ ٹی وی کے فحش اشتہارات، وی سی آر، انٹرنیٹ اور آمد و رفت کی تیز رفتاری نے بہت سی برائیوں اور بیماریوں کو تھوڑے ہی عرصے میں جنگل کی آگ کی طرح پوری دُنیا میں پھیلا دیا۔ ایڈز (AIDS) بھی موجودہ دور کی ایسی بلا ہے جو تعلیم یافتہ اور مہذب سمجھی جانے والی مادہ پرست اور جدیدیت کے نام پر جنسی بے راہ روی کو اپنانے والی اقوام کے ذریعہ اس تیزی سے پھیلی کہ ماہرین طب و عمرانیات اُس کی ہولناکی سے بری طرح بدحواس ہیں۔

ایڈز (AIDS) ایک شخص سے دوسرے میں منتقل ہونے والا ایک ناقابل علاج مہلک عارضہ ہے جو 1980 کے بعد دریافت ہوا لیکن اس قدر تیزی سے پھیلا کہ اب تک دو کروڑ سے زائد افراد اس کی گرفت میں آکر دردناک موت کا شکار بن چکے ہیں۔ نیز ایک جائزے کے مطابق ایڈز کے پھیلاؤ میں زیادہ تر (85 فیصد سے زائد) جنسی بے راہ روی یعنی حرام کاری اور لواطت جیسی قبیح حرکتوں کا دخل ہے۔

ایڈز (AIDS) انگریزی زبان کے چار الفاظ کے مخففات کا مرکب ہے جس کی تفصیل اس طرح ہے:

اکوائرڈ A - Aquired

امیونو I - Immuno

ڈیفی شینسی D - Deficiency

سنڈروم S - Syndrome

مندرجۂ بالا کے مفہوم کچھ اس طرح ہوئے۔ ''دوسری جگہ سے حاصل کیا گیا وہ علامیہ جو بیماریوں سے مقابلہ کرنے والی قدرتی قوت مدافعت کو کم کردیتا ہے''۔ لہٰذا اُردو میں ہم ایڈز کو ''اکتسابی قلت تحمینی علامیہ'' سے موسوم کرسکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قوت دافعہ کے کمزور پڑنے پر جسم بہ آسانی مختلف بیماریوں کا شکار ہوجاتا ہے جو آخر کار اُس کو موت کے منہ میں پہنچادیتی ہیں۔

ایڈز کا وائرس

تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ ایڈز ایک چھوٹے سے وائرس کے ذریعے پھیلتا ہے۔ یہ وائرس طاقتور خوردبین سے بھی دکھائی نہیں دیتے بلکہ ان کے مشاہدے کے لیے الیکٹرانک خوردبین کی ضرورت پڑتی ہے۔ طب کی اصطلاح میں ایڈز کے وائرس کو ایچ آئی وی (HIV) کہتے ہیں۔ ایچ آئی وی بھی انگریزی کے تین الفاظ ہیومن (Human)، امیونو ڈیفی شینسی (Immuno Defiency)، وائرس (Virus) کا مخفف ہے۔ اس کے نام سے ظاہر ہے کہ یہ وائرس ہی ایڈز پھیلنے کا ذریعہ ہے۔ یہ ایسا خطرناک اور سخت جان وائرس ہے کہ دیگر بیماریوں کے جرثوموں کو تباہ کرنے والی تمام دوائیں، اینٹی بایوٹکس (Antibiotics) وغیرہ اس وائرس کے لیے بے اثر رہتی ہیں۔ جب کسی بیماری کے جراثیم، بیکٹیریا (Bacteria) فنگس (Fungus)، وائرس (Virus) وغیرہ ہمارے جسم پر حملہ آور ہوتے ہیں تو ہمارے خون میں موجود کریات بیضا (WBC) اُن کا گھیراؤ کرکے اُن کو قابو میں کرلیتے ہیں اور اُن جرثوموں کی نشوونما رُک جاتی ہے۔ یعنی بیماری پر کنٹرول ہوجاتا ہے لیکن اگر کسی بنا پر کریات بیضا کی تعداد یا قوت کم ہوجاتی ہے تو جسم کی قوت مدافعت کمزور پڑجاتی ہے لہٰذا جسم بیماری کی گرفت میں آجاتا ہے۔ عام فہم زبان میں ایڈز کا وائرس یعنی HIV ایسا طاقتور جرثومہ ہے جس کو زیر کرنے میں WBC نہ صرف ناکام رہتے ہیں بلکہ HIV انھی کے درمیان رہ کر پروان چڑھتا ہے اور کریات بیضا (WBC) کی قوت دافعہ کو مفلوج بھی کرتا رہتا ہے۔ ایک صحت مند جوان کے جسم میں ایک بار داخل ہونے کے بعد تقریباً آٹھ سال کی مدت میں یہ وائرس مکمل نشوونما پاجاتا ہے اور اس دوران جسم کی قوت دافعہ اس قدر مفلوج ہوچکی ہوتی ہے کہ وہ معمولی قسم کے دوسرے جرثوموں پر قابو پانے کی بھی اہل نہیں رہ جاتی۔ دراصل اسی درجہ تک پہنچنے پر کہا جاتا ہے کہ اُس شخص کو ایڈز ہوگیا ہے۔ پھر ایک سے تین سال کے اندر ہی وہ شخص مختلف بیماریوں کی تاب نہ لاکر موت کا لقمہ بن جاتا

ہے۔ ایک مرتبہ ایڈز وائرس کے کسی انسانی جسم میں داخلے کے بعد پوری طرح پروان چڑھنے میں کتنی مدت لگتی ہے اس کا انحصار اس شخص کی اپنی صحت یعنی قوت دافعہ پر ہے۔ اچھی صحت کے جوانوں میں یہ وقفہ آٹھ سے بڑھ کر بارہ سال تک ہوسکتا ہے جبکہ چھوٹے بچوں اور بوڑھوں میں یہ وقفہ تین تا پانچ سال ہوسکتا ہے۔

ایڈز کے وائرس (HIV) پر چونکہ نہ کوئی دوا کارگر ہے اور نہ انسان کی قوت دافعہ اس کا مقابلہ کرپاتی ہے، اس لیے مکمل نشوونما سے قبل بھی اگر یہ وائرس کسی طرح ایک شخص سے دوسرے کے جسم میں پہنچ جاتا ہے تو اُس کو پہلے کی طرح متاثر کرتا ہے۔

علامات

ایڈز وائرس کے جسم میں داخلے کے بعد زیادہ تر افراد میں کوئی علامت ظاہر نہیں ہوتی۔ وہ دوسروں کو بھی بالکلیہ صحت مند دکھائی دیتے ہیں اور خود بھی اپنے آپ کو صحت مند ہی محسوس کرتے ہیں۔ چند سال بعد کچھ افراد میں مختلف علامات ظاہر ہوتی ہیں۔ مثلاً وائی بخار یا تھوڑے وقفہ سے بار بار بخار آنا، کمزوری اور تھکاوٹ، وزن میں نمایاں کمی ہونا، دستوں کا جاری رہنا، گردن، بغل اور جانگھ کے نیچے گلٹیوں کا پیدا ہونا۔ ایک عجیب بات یہ بھی دیکھی گئی ہے کہ کچھ افراد میں مذکورہ علامات تھوڑے وقفے کے بعد معدوم ہوجاتی ہیں لیکن کچھ عرصے بعد زیادہ شدت سے ظاہر ہوتی ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ مریض کی قوت مدافعت کمزور ہوتی رہتی ہے اور اُس پر اُن جراثیمی بیماریوں کا حملہ بہ آسانی اور بار بار ہوتا رہتا ہے جو عام طور پر بغیر دوا کے یا معمولی علاج ومعالجے سے جلد دور ہوجاتی ہیں۔ چونکہ خون کی گردش کے ساتھ یہ وائرس پورے جسم میں سرایت کرجاتا ہے اس لیے جسم کے تمام اعضا کو، جن میں دماغ بھی شامل ہے اور جن کے افعال کا تعلق خون کی صحت یا درستگی سے ہے، متاثر کرتا ہے۔ زیادہ تر ایڈز کے مریض مخصوص قسم کے نمونیہ یا کینسر کا شکار ہوکر موت کی آغوش میں پہنچ جاتے ہیں۔

کوئی شخص ایڈز وائرس کا شکار ہوچکا یا نہیں، اس کی پہچان اس کے خون کی جانچ کے ذریعے کی جاتی ہے۔ اگر جانچ میں ایچ آئی وی کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے تو کہا جاتا ہے وہ شخص HIV مثبت یا Positive ہے۔ ایسا شخص بھلے ہی بظاہر تندرست دکھائی دے یعنی وائرس کی نشوونما مکمل نہ بھی ہوئی ہو لیکن اگر اُس کا خون کسی ذریعے سے کسی دوسرے شخص کے جسم میں داخل ہوجائے تو اس کو بھی HIV Positive بنادے گا۔

وائرس کے ذرائع سرایت

ایک شخص سے دوسرے میں ایچ آئی وی کے منتقل ہونے کی مندرجہ ذیل تین شکلیں ممکن ہیں:

(الف) کسی ایچ آئی وی مثبت (Positive) شخص کے خون، پیپ یا خون سے تیار کردہ کسی مادّے کی مقدار کا کسی صحت مند جسم میں داخل ہونا۔

(ب) کسی ایچ آئی وی متاثر شخص کے مادّہ منویہ کا کسی بھی راستے سے کسی صحت مند شخص کے جسم میں منتقل ہونا۔

(ج) پیدائش سے قبل رحم مادر کے سیال مادّہ یا پیدائش کے بعد دودھ کے ذریعے ماں سے بچے کے جسم میں داخل ہونا۔

مذکورہ بالا شکلوں میں سے (الف) اور (ب) مندرجۂ ذیل ذرائع سے وجود میں آسکتی ہیں:

1. کسی متاثر شخص کے خون یا پلازمہ کی دوسرے صحت مند شخص کے جسم میں منتقلی۔
2. کسی متاثر شخص کو انجکشن لگانے، کان چھیدنے یا جسم کے کسی حصے کو گودنے کے بعد سوئی کو بغیر جراثیمی اثر سے پاک کیے کسی صحت مند شخص کے لیے استعمال کرنا۔
3. متاثر شخص کا شیو بنانے کے بعد بلیڈ کو یا آپریشن کرنے کے بعد سرجری کے آلات کو دافع عفونت تدابیر اختیار کیے بغیر دوسرے شخص کے لیے استعمال کرنا۔
4. کسی متاثر شخص جس کے مسوڑھوں سے خون یا پیپ جاری ہوتا ہو کسی صحت مند شخص کو کاٹنے سے۔
5. کسی متاثر شخص (مرد یا عورت) کا کسی صحت مند (عورت یا مرد) سے جنسی تعلق قائم کرنا۔
6. ٹسٹ ٹیوب بے بی کی بارآوری کی غرض سے کسی متاثر مرد یا عورت کے مادّہ منویہ کو کسی صحت مند عورت کے جسم میں داخل کرنا۔
7. کسی متاثر شخص کے کسی عضو کی دوسرے شخص کے جسم میں پیوندکاری۔

کن باتوں سے ایڈز نہیں پھیلتا

اگر مذکورہ بالا کوئی شکل نہ پائی جائے تو ایڈز نہیں پھیلے گا، لہٰذا مندرجۂ ذیل کسی وجہ سے ایڈز نہیں پھیلے گا۔

1. مصافحہ کرنے سے یا بوس وکنار سے۔
2. متاثر شخص کے سانس، چھینک یا تھوک سے۔
3. ایسی مباشرت سے جس میں مادّہ منویہ فریق ثانی کے جسم میں داخل نہ ہو۔
4. کسی متاثر شخص کو کھٹل، مچھر، پسو کاٹ لینے کے بعد کسی غیر متاثر کو کاٹ لینے سے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے واضح ہوگیا کہ کسی معالج یا تیماردار کو ایڈز سے متاثر

شخص سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

علاج

تا دمِ تحریر ایڈز وائرس کو ختم کرنے یا قابو میں کرنے کی کوئی مؤثر دوا یا ویکسین (Vaccine) ایجاد نہیں ہو سکی ہے۔ البتہ قوت مدافعت کمزور ہونے کے نتیجے میں جو امراض پیدا ہو جاتے ہیں ان کا علاج کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے مریض کا عرصۂ حیات کچھ بڑھ جاتا ہے۔ لیکن جب وائرس پوری طرح پروان چڑھ جاتا ہے تو یہ وقفہ سال دو سال سے زائد نہیں ہوتا، کیونکہ ایک طرف تو قوت مدافعت انتہائی لاغر ہو چکی ہوتی ہے اور دوسری طرف جو دوائیں دیگر امراض کے ازالے کے لیے دی جاتی ہیں وہ بھی نقصان دہ (Toxic) ثابت ہونے لگتی ہیں اور ذیلی اثرات (Side-effects) کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اسی لیے دُنیا بھر میں جہاں ایک طرف ایڈز کی کامیاب دوا یا ویکسین ایجاد کرنے کی کوشش ہو رہی ہے وہیں دوسری طرف اربوں روپے سالانہ عوام الناس کو ایڈز سے بچاؤ کے طریقوں کی تشہیر پر صرف کیے جا رہے ہیں۔

ایڈز سے بچاؤ

مندرجہ ذیل تدابیر اختیار کرنے سے بڑی حد تک ایڈز کے پھیلاؤ کو روکا جا سکتا ہے۔

1. خون یا پلازمہ چڑھانے سے قبل اُس کا ایچ آئی وی ٹسٹ ضرور کرایا جائے۔
2. انجکشن سے قبل سرنج کو جراثیم سے پاک کیا جائے یا نئی سرنج ہی استعمال کی جائے۔
3. حجامت اور شیو بنواتے وقت دوسروں کے استعمال شدہ بلیڈ سے گریز کیا جائے۔
4. جنسی آسودگی کے لیے ناجائز طریقوں سے بالکلیہ اجتناب کیا جائے۔
5. اگر زن و شو میں سے خدانخواستہ کوئی ایچ آئی وی مثبت ہو تو مقاربت کے وقت رفالہ (کنڈوم) لازمی طور پر استعمال کیا جائے۔
6. کسی عضو کی پیوند کاری سے پہلے عضو دینے والے (Donor) کے ایچ آئی وی مثبت نہ ہونے کا اطمینان کر لیا جائے۔
7. بچے کو کسی ایسی عورت کا دودھ نہ پلایا جائے جس کے بارے میں کچھ بھی شبہ ہو۔

ایڈز سے متعلق ہماری ذمے داریاں

ایڈز جیسی بھیانک بیماری سے خود کو بچانے کے ساتھ معاشرے میں اس کی روک تھام نیز ایڈز سے متاثر افراد کے سلسلے میں ہماری کچھ اخلاقی اور معاشرتی ذمے داریاں ہیں جیسے:

1. کسی ایچ آئی وی مثبت شخص کے چال چلن کے بارے میں بلا تحقیق کوئی رائے نہ قائم کی جائے۔ یہ درست ہے کہ 85 فیصد سے زائد افراد جنسی بے راہ روی کی وجہ سے ہی اس موذی عارضے کا شکار ہوتے ہیں لیکن عین ممکن ہے کہ وہ شخص بقیہ 15 فیصد کے زمرے میں آتا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی لاپرواہ کپاؤنڈر کے انجکشن کی سوئی یا کسی لاپرواہ حجام کے اُسترے کے ذریعے ایچ آئی وی کی زد میں آیا ہو۔
2. اگر کسی کو یہ علم ہو کہ خدانخواستہ وہ ایچ آئی وی سے متاثر ہے تو شریک حیات سے بغیر رفالہ (کنڈوم) جنسی تعلق قائم نہ کرے۔
3. اس موذی عارضے سے حفاظت کے لیے ایسے خاندانوں میں رشتہ کرنے سے گریز کرے جہاں بے باکی یا عریانیت موجود ہو کیونکہ وہاں ایڈز سے متاثر افراد کا ہونا عین ممکن ہے۔
4. چونکہ ایڈز سے متاثر شخص کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے یا کھانے پینے سے یہ عارضہ اُس کے معالج یا تیماردار میں منتقل نہیں ہوتا اس لیے ایڈز کے مریضوں کی تیمارداری میں کوتاہی نہ کریں۔
5. ایڈز کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے انسان دوستی کا تقاضا ہے کہ عوام و خواص کو اُن برائیوں سے بچانے کی فکر کی جائے جن کی بدولت اکثر افراد اس عارضے کا شکار ہو سکتے ہیں مثلاً عورتوں کا بناؤ سنگھار کے ساتھ کھلے عام پھرنا، نامحرم مردوں اور عورتوں کا باہم اختلاط، ٹی وی وغیرہ پر اخلاق سوز پروگراموں کو دیکھنا وغیرہ۔

پتہ:
Naseem Manzil
Madeh Ganj, Police Chowki,
Sitapur Road, Lucknow-20

□□□

بچوں کی صلاحیتیں ان کی مادری زبان سے ابھرتی ہیں۔
گھروں میں بہتر اردو تعلیم کا انتظام کیجیے۔
اردو کی نئی نسل کو تیار کرنا ہم سب کا فرضِ اولیں ہے۔

جگدیش پرشاد ورما

ہماری قوت مدافعت ہی ہمیں صحت مند رکھتی ہے

ڈاکٹر رولنڈ جے گلاسر نے کہا ہے کہ ہمارا جسم ہی ہمارا محافظ ہے۔ سائنس، انٹی بایوٹک، مشین اور نئے وسائل سب کچھ جسم کے آگے غیر اہم ہیں۔ تاریخ پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہیضے سے دنیا میں لاکھوں لوگوں کی موت ہوئی ہے۔ اس وبائی مرض میں ایلوپیتھی دوائیاں ناکام ہوگئی تھیں۔ زیادہ تر ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ اس وبا کے لیے ہیضہ پیدا کرنے والے جراثیم ذمے دار ہیں۔ لیکن سبھی اس سے متفق نہیں تھے۔ چند ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ حقیقتاً ایک صحت مند انسان صرف ہیضے کے بیکٹیریا کے رابطے میں آنے سے ہی بیمار ہوکر نہیں مرسکتا ہے۔ کچھ لوگوں نے اس سلسلے میں بہت دلچسپ تجربے کیے۔ 1900 کے آس پاس ایک 74 سالہ ڈاکٹر ''میکس'' کروڑوں ہیضے کے جراثیم کا ایک مکسچر (گھول) جان بوجھ کر پی گئے تھے۔ اور لوگوں نے بھی اس قسم کے تجربے کیے۔ سبھی کیج Stool جانچ میں ہیضے کے جراثیم پائے گئے۔ لیکن کوئی تجربہ کرنے والا شخص ہیضے کے مرض میں مبتلا نہیں ہوا۔ خون میں موجود سفید خلیے WBC حملہ آور جراثیم کو مار دیتے ہیں۔ ایک سائنس داں نے انفکشن کے خلاف جسم کی قوت مدافعت کا کافی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ان کا یقین تھا کہ متعدی مرض سے نجات پانے کے لیے کیمیائی ادویات کے بجائے جسم کی اپنی قوت مدافعت میں اضافے کی ضرورت ہے۔

مائکرو بایولوجی کے موجد مشہور سائنس داں لوئی پاسچر کا یقین تھا کہ ہر مرض کا سبب کوئی نہ کوئی جرثومہ ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں انھیں محسوس ہوا کہ مرض کا سبب دراصل جراثیم نہیں بلکہ وہ جگہ ہے جہاں جراثیم پیدا ہوتے ہیں۔ غذائی عوامل کے ذریعے جراثیم کی مدافعت نہ کرپانا ہی دراصل مرض کا سبب ہے۔ اگر غذائی عنصر طاقتور ہوتو جراثیم اثر انداز ہو ہی نہیں سکتے۔ پاسچر اس نتیجے پر پہنچے کہ خوراک، تناؤ، حالات اور مزاج کے ساتھ ساتھ ان گنت ایسے عوامل ہیں جن کا گہرا اثر ہماری قوت مدافعت پر پڑتا ہے۔ گذشتہ پانچ چھ دہائیوں سے بہت سے متعدی امراض میں مبتلا لاتعداد لوگوں کی جان بچانے کے لیے انٹی بایوٹک دواؤں کی تعریف کی جاتی رہی ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ ان دواؤں نے حیرت انگیز کام کیا ہے۔ لیکن متعدی امراض میں آئی کمی کا پورا کریڈٹ انٹی بایوٹک کو نہیں دیا جاسکتا ہے۔ تپ دق، نمونیا، ڈپتھیریا یا اسکارلٹ بخار، کالی کھانسی اور ٹائیفائیڈ وغیرہ جیسے امراض میں انٹی بایوٹک کی ایجاد سے قبل ہی کافی کمی آگئی تھی۔ انگلینڈ کے ڈاکٹر تھامس بلیون نے اپنی جانچ میں یہ پایا کہ متعدی امراض کے سبب ہونے والی جانی نقصان میں شماریاتی کمی آنے کا سبب زندگی کے معیار کا بڑھنا، اچھی غذا، صفائی پر خاص توجہ وغیرہ ہیں۔

بیکٹیریا بہت ہی چالاک جراثیم ہیں۔ ہماری نئی سے نئی انٹی بایوٹک کو بیوقوف بنانے میں اسے بہت کم وقت لگتا ہے۔ وہ ہمارے جدید سے جدید اور طاقت ور انٹی بایوٹک کو غیر موثر کردیتے ہیں۔ نتیجتاً ہمیں ایک نئی دوا ڈھونڈنی پڑتی ہے۔ اس طرح ہمیں ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری نئی انٹی بایوٹک کا ایجاد کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ سلسلہ ختم ہوتا نہیں دکھائی دیتا ہے۔ پنسیلین کے موجد الگزنڈر فلیمنگ نے اس دوا کے حد سے زیادہ استعمال سے مدافعتی بیکٹیریا کے پیدا ہونے کے خطرے سے ہمیں آگاہ کیا تھا۔ لیکن شاید ہم نے اس پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔ ہم عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ سارے بیکٹیریا نقصان دہ ہوتے ہیں لیکن سائنس دانوں نے یہ ثابت کیا کہ یہ سچ نہیں ہے۔ ہمارے جسم کے کئی حصوں میں موجود کچھ بیکٹیریا صحت کے بے حد فائدہ مند ہوتے ہیں۔ یہ ہمیں مختلف قسم کے انفکشن سے بچاتے ہیں۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ انٹی بایوٹک کے استعمال سے نقصان دہ جراثیم کے ساتھ ساتھ فائدہ مند جراثیم کا بھی صفایا ہوجاتا ہے۔ جو واضح طور پر ہماری صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ بہت زیادہ طاقتور انٹی بایوٹک کسی دہشت گرد کے ذریعے بھیڑ بھاڑ والے علاقے میں ایک مشین گن سے اندھا دھند گولی چلانے جیسا ہے جس میں دشمنوں کے علاوہ آس پاس کے معصوم اور بے گناہ لوگوں کی بھی جانیں چلی جاتی ہیں۔ مرض پیدا کرنے والے جراثیم کو مارنے کے عمل میں انٹی بایوٹک دوائیں انسان کے جسم میں پنپ رہے فائدہ مند بیکٹیریا کو بھی ختم کردیتی ہیں۔ یہ ہمارے جسم کے مختلف اعضا اور نظاموں کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ ہماری قوت مدافعت کو بھی کمزور کردیتی ہیں۔ اس میں شک نہیں ہے کہ متوازن غذا، مناسب ورزش، تناؤ سے آزاد زندگی، اور صحت کے دوسرے قدرتی اصولوں کی تعمیل کرکے ہم اپنی قوت مدافعت کے نظام کو مضبوط اور طاقت ور بنا سکتے ہیں اور ایک صحت مند زندگی گزار سکتے ہیں۔

(ہندی سے ترجمہ، مترجم: ایس.ایس.رضا)

□□□

پتہ:
C-320/2, Shaheen Bagh, Abulfazl Enclave-II,
Okhla, New Delhi-110025

آر۔رام چندرن

پراسرار بادل

● موسمی بارش کی کنجی شاید بحرہند کی فضا کے پاس ہے اور سائنس داں اس کے رول کو سمجھنے کا آغاز کرچکے ہیں۔

ایک اور مانسون ختم ہوا اور اس کے ساتھ ہی ہندوستانی محکمۂ موسمیات (IMD) پیش گوئی (LRF) کی صلاحیت کا ایک اور تجربہ ہوا۔ جس نے اس سال کے مانسون کو فیاض بتایا تھا اور خریف کی زبردست فصل کی توقع کی تھی لیکن IMD کا 2007 کا یہ نیا ماڈل (LRF) مجموعی طور پر ملک کے مکمل موسمی بارش (یکم جون تا 30 ستمبر) کی پیش گوئی کرنے میں ناکام رہا۔ پچھلے سال کی طرح اس سال بھی بارش کی زمانی اور مکانی تقسیم مختلف ثابت ہوئی۔

پچھلے چار برسوں میں IMD کی پیش گوئی دو مرحلوں میں جاری ہوچکی ہے۔ پہلی پیش گوئی اپریل میں جاری کی گئی اور مئی جون کے اعداد و شمار کی بنیاد پر جون میں دوسری پیش گوئی جاری کی گئی۔ منطقہ حارہ بحرالکاہل پر درجۂ حرارت کی عدم یکسانیت کے پیش نظر دو پیش گوئیوں کے لیے پیمانے مختلف ہوتے ہیں۔

اس سال مجموعی پیش گوئی کے طریقۂ کار کو اختیار کیا گیا تھا اور مختلف ہندوستانی اداروں کی تجرباتی پیش گوئیوں اور اسی طرح بین الاقوامی اداروں کی عملی اور تجرباتی پیش گوئیوں کے مناسب اور موزوں طریقہ ہائے کار کو شامل کرلیا گیا تھا۔

شماریاتی پیش گوئی ماڈل نے آٹھ پیمانوں کا استعمال کیا؛ اپریل کی پیش گوئی پانچ پیرامیٹر سب سیٹ (Parameter Subset) کی بنیاد پر تھی جبکہ جون کے لیے چھ Parameter Subset کا استعمال کیا گیا۔ اپریل ماڈل نے ہندوستانی موسم گرما کی بارش (Indian Summer Momoon Rainfall) کے متعلق یہ بتایا کہ یہ طویل المدتی اوسط (Long Period Average) کا 95 فیصد ہوگا جو 5 فیصد مثبت یا منفی کی ایک ماڈ غلطی کے ساتھ 89 سنٹی میٹر (1990-1941 کے اعداد و شمار کے مطابق) لیا جاتا ہے۔

مانسون کی ہفتہ وار سست و رفتار سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ بارش کی سرگرمی ابتدائی جون میں دیر سے شروع ہوئی تھی۔ بنیادی طور پر مئی کے مہینے میں بحرعرب میں سائکلونک طوفان "آکاش" کے سبب ایسا ہوا تھا جس نے مانسون کی رفتار کو متاثر کیا تھا اور اس کے فوراً بعد مشرق مرکزی بحرعرب پر سوپر سائکلون "گونو" نے اس کی پیش قدمی کو روک دیا تھا۔ ہفتہ وار پیمانے پر جولائی کے دوسرے نصف میں عام "مانسونی وقفے" کے علاوہ بارش کی سرگرمی اس وقت سے یکساں طور پر کم یا زیادہ نارمل سے مختلف ہوگئی۔ خاص طور پر نارمل مانسون کی بہ نسبت ایک ہلکی نکاسی کے ساتھ موسم کے آخر میں بارش کی سرگرمی رفتار پکڑتی ہے۔ ستمبر کے آخری ہفتے میں بھی معنی خیز طور پر نارمل سے زیادہ بارش ہوئی تھی۔ زمانی تقسیم کچھ اس طرح تھی: جون کے LPA سے 19+ فیصد زیادہ، جولائی 3- فیصد، اگست میں 1- فیصد اور ستمبر میں 18+ فیصد، نتیجتاً مکمل موسمی بارش پیشن گوئی کی مقدار سے کہیں زیادہ ہوئی۔

حقیقی موسمی بارش 93.7 سینٹی میٹر تھی۔ 82.8 سینٹی میٹر (LPA کا 93 فیصد) کم بارش کی پیش گوئی کے برخلاف 5 فیصد زیادہ بارش ہوئی۔

مکانی تقسیم بھی بڑی عجیب و غریب رہی۔ 36 موسمیاتی سب ڈویژن میں سے 30 نے زیادہ اور 6 نے کم بارش حاصل کی۔ 13 سب ڈویژن نے غیر معمولی طور پر زیادہ بارش حاصل کی۔ ناقص سب ڈویژن میں سے پانچ (مغربی اتر پردیش، ہریانہ، چنڈی گڑھ، دہلی، پنجاب، ہماچل پردیش اور مشرقی مدھیہ پردیش) نے معتدل سوکھے کی صورت حال (26 سے 50 فیصد کم بارش) کا تجربہ کیا۔ کچھ سب ڈویژن مثلاً سوراشٹر، کچھ اور دیو (85+ فیصد) نے غیر معمولی طور پر زیادہ بارش حاصل کی۔

مانسون کی مذکورہ اوسط کارکردگی بنیادی طور پر زیادہ بارش کے سبب ہے جسے جنوبی جزیرہ نما اور خاص طور پر مرکزی ہندوستان میں اوسط بارش کی بہ نسبت بہت زیادہ دیکھا گیا۔ "شدید گرمی کے ساتھ جنوبی جزیرہ نما اور مرکزی ہندوستان کے علاقے میں اور ہلکی گرمی کے ساتھ شمال اور شمال مشرق میں بارش کی تقسیم کسی قدر غیر معمولی بات ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ اس وقت ہمارے پاس کس طرح کا مخصوص مانسون تھا، ہمیں سابقہ ریکارڈ کی طرف واپس جانا ہوگا۔ یہ باتیں ایم۔راجیون نے کہی جو موسمیات کے ایڈیشنل ڈائرکٹر جنرل اور کلائمیٹ ریسرچ سینٹر آئی ایم ڈی، پونہ کے ڈائرکٹر ہیں۔

جون کے مہینے میں IMD اگرچہ 2007 کو ناقص مانسون کے سال کے طور پر پیش کررہا تھا لیکن دنیا کے بڑے ماحولیاتی/فضائی تحقیقی مراکز مثلاً برطانیہ میں واقع یورپین سینٹر فار میڈیم رینج ویدر فارکاسٹنگ (ECMUF) اور امریکہ میں واقع نیشنل سینٹر فار انوائرنمنٹل میری ڈکشن (NCEP)، انٹرنیشنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (IRI) اور سماج اور ایکسپری مینٹل کلائمیٹ پری ڈکشن سینٹر (ECPC)

هندوستانی برصغیر میں نارمل سے زیادہ بخارات کی پیش گوئی کر رہے تھے۔

یہ پیش گوئیاں۔ جو IMD کے شماریاتی ماڈل کے برخلاف تھیں۔ یہ پایا گیا ہے کہ مشرقی بحرالکاہل کی بہ نسبت مرکزی بحرالکاہل (جسے نینو 5N-5S, 120-170w:3.4 کے طور پر جانا جاتا ہے) پر مانسون کی بارش نقل حرارت سے زیادہ پرزور انداز میں ہم رشتہ ہوتی ہے۔ 1982 اور 1987 کے ایل نینو خشک سالی سے وابستہ تھے اور 1988 کا لانینا ضرورت سے زیادہ بارش سے۔ 50 سال سے بھی زائد کے اعداد وشمار ظاہر کرتے ہیں کہ جب کبھی بھی ENSO سازگار (La Nina) رہا، خشک سالی نہیں آئی اور جب کبھی بھی ناسازگار (El Nino) رہا، زیادہ بارش نہیں ہوئی۔ حالانکہ 1997 ایک استثنائی سال رہا جب شدید ایل نینو ہوا۔ درحقیقت یہ ملک کا زبردست ایل نینو تھا۔ اس کے باوجود موسمی بارش اوسط سے زیادہ (LPA کا 101.9 فیصد) ہوئی۔ اگرچہ یہ ضرورت سے زیادہ مانسون نہیں تھا۔

هندوستانی بارش پر ENSO کی اثر اندازی کے متعلق از سر نو غور کرنے کے لیے حالیہ برسوں کے مانسون نے راہ ہموار کی ہے۔ 1997 کا زبردست ایل نینو واقعہ جس کے نتیجے میں حقیقتاً اوسط سے زیادہ بارش ہوئی تھی۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹراپیکل میٹرولاجی (IITM) پونہ کے کے. کرشن کمار اور ان کے ساتھی 1999 میں یہ رائے ظاہر کی کہ ENSO اور ISMR کے درمیان رشتہ کمزور ہوا ہے۔

IOD نے مغربی خطِ استوائی بحرہند (افریقہ کے مشرقی ساحل سے دور، مداگاسکر کے شمال نصف سے شمالیا کے شمال کنارے تک) اور جنوبی بحرہند (آسٹریلیا کے شمالی ساحل سے دور اور مکمل انڈونیشیا) کے درمیان SST اختلاف کا حوالہ دیا ہے۔

ایک مثبت IOD مرحلے کے درمیان پہلے SST بڑھتا ہے اور بعد میں کمی آنے لگتی ہے اور یہی صورت حال منفی مرحلے میں بھی ہوتی ہے۔ یاماگاتا نے یہ دلیل پیش کی کہ اچھا مانسون مثبت IOD مرحلے سے وابستہ ہوتا ہے۔ اگرچہ ISMR کے ساتھ IOD اشاریہ کا باہم رشتہ خطِ استوائی مغربی بحرہند اور مشرقی افریقہ کی بارش کے باہمی رشتے کے مقابلے میں بہت ہی خراب پایا گیا تھا۔ یاماگاتا کے مطابق اس سال بھی IOD ایک مثبت مرحلے میں ہے۔ یاماگاتا کی جماعت نے 1999 میں آئی.او.ڈی. Phenomenon کی دریافت کی تھی۔

حالیہ تجزیہ کرنے والوں میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس (ISSc) بنگلور کی سلوچنا گاڈگل اور ان کی ساتھیوں نے یہ واضح کیا ہے کہ جب ISMR کے ساتھ IOD باہم وابستہ نہیں ہوتا ہے، جسے وہ خطِ استوائی بحرہند آسکالیشن (Equinoo) کا نام دیتے ہیں، تو وہ ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ بہتر تعلق پیدا کرتے ہیں۔

موٹے طور پر Equinoo کو IOD کے فضائی حصے کے طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ حالانکہ IOD کے مثبت (منفی) مرحلوں کے درمیان بہت گہرا تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ SST کی بے قاعدگی نہ صرف یہ کہ سطحی ہواؤں بلکہ خطے میں بحری Upwelling کی بناوٹ پر بھی منحصر ہوتی ہے۔ سلوچنا گاڈگل اور ان کی ساتھیوں نے واضح کیا ہے کہ ENSO اور Equinoo کے ایک مخلوط اشاریے کے ساتھ ISMR (سوکھا اور شدید بارش) کی انتہائی توقعات کے درمیان ایک مضبوط باہمی وابستگی موجود ہے۔

ENSO اور Equinoo اشاریے کے ساتھ 1979-2004 کے لیے ISMR اعداد وشمار کی باہمی وابستگی کا سلوچنا گاڈگل کی جماعت نے جس طرح کا تجزیہ کیا ہے، اس میں یہ مشورہ بھی شامل ہے کہ ایک مثبت Equinoo جو کہ WEIO پر اضافہ شدہ بخارات سے وابستہ ہے، بہتر مانسون کے لیے سازگار ثابت ہوتا ہے۔

1994 میں ENSO نا سازگار تھا لیکن Equinoo سازگار تھا اور یہ ضرورت سے زیادہ مانسون تھا۔ حالانکہ 1997 کی بہ نسبت 2002 میں ENSO بہت کمزور تھا Equinoo بھی ناسازگار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شدید سوکھا پڑ گیا تھا۔ اس طرح سلوچنا گاڈگل کی جماعت یہ دلیل پیش کرتی ہے کہ "Equinoo کے ساتھ نہ صرف یہ کہ خشک سالی کی وضاحت کی جاسکتی ہے جو ایل نینو کی غیر موجودگی یا کمزور ایل نینو کی موجودگی میں آئی تھی، بلکہ ضرورت سے زیادہ بارش ہونے والے موسموں کی بھی وضاحت کی جاسکتی ہے جس میں ENSO نا سازگار ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خشک سالی دونوں طرح کے ناسازگار مرحلوں سے وابستہ ہے۔

لیکن 1958-2004 کے دوران تمام موسموں کے لیے ISMR کے تجزیے میں جماعت نے پرمعنی انداز سے جو کچھ بھی اخذ کیا ہے، جب ہم ENSO-EQUINOO اشاریوں کے مشترکہ Prism کے ذریعے اسے دیکھتے ہیں تو ضرورت سے زیادہ اور ناقص بارش کے سال کے درمیان ایک واضح علاحدگی نظر آتی ہے۔ اس کے محرکات اس بات پر زور دیتے ہیں کہ یہ تعلق وقتی ہے۔ مثال کے طور پر، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مئی میں EQUINOO اشاریاتی قدریں، ISMR کے ساتھ بہت ہی خراب باہمی وابستگی رکھتی ہیں جبکہ جون کی قدریں جولائی اور اگست کے نصف موسم بارش کے ساتھ بہتر باہمی وابستگی رکھتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جولائی/اگست کی قدریں ستمبر کی بارش سے اچھی طرح باہم وابستہ نظر آتی ہیں۔ مانسون 2006 کی کارکردگی میں یہ عمل

صاف طور پر واضح تھا۔ جہاں تک جولائی کے آخر کے مانسون کا تعلق ہے، یہ نارمل سے نیچے تھا۔ مثبت EQUINOO صورت حال کے بعد کی ترقی نے اگست/ستمبر میں پیدا شدہ کمی کے لیے راہ ہموار کی تھی۔

سلوچنا گاڈگل کے مطابق اس سال مثبت EQUINOO صورت حال جو WEIO پر اضافہ شدہ نقل حرارت ہے، جون سے حاوی ہو چکا ہے اور یہ صورت حال اس سال ضرورت سے زیادہ بارش کے لیے بہتر سبب بن سکتا ہے۔ لانینا کے لیے نہیں جیسا کہ ہائبرڈ ماڈلوں کے ذریعے پیش گوئی کی گئی تھی۔ وہ بتاتی ہیں کہ ہائبرڈ ماڈل بحرہند کے اس Phenomenon پر اب بھی قابض ہونے سے قاصر ہیں۔

اس طرح EQUINOO پر مرکوز تفصیلی مطالعے اب اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ وہ اس بات کی تشخیص کریں کہ مستقبل کے مانسون کو بیان کرنے کے لیے وہ کتنے اہل ہیں اور پیش گوئی کے اوزار کے طور پر اس کا کس طرح بہتر استعمال کیا جاسکتا ہے۔

سلوچنا گاڈگل کہتی ہیں کہ تمام باتیں آسان نہیں ہوسکتیں۔ اس سال کی اب تک کی ناکامیابی کے باوجود، اس سے قبل کہ اس کے ساتھ بے ڈھنگا سلوک کیا جائے، مزید موسموں کے لیے موجودہ IMD ماڈل کی کارکردگی کا مشاہدہ کیا جانا چاہیے۔

(بشکریہ: فرنٹ لائن، 2 نومبر 2007)

تلخیص و ترجمہ: محمد عمر رضا

□□□

352, Sutlej Hostel,
JNU, New Delhi-110067

جدید
ہندی — اردو لغت (دو جلدوں میں)

(ہندی الفاظ کے معنی اردو اور دیوناگری رسم الخط میں)

مرتب: پروفیسر نصیر احمد خاں

(سابق چیئرپرسن، ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی)

ٹیکنک اور ترتیب و تقسیم کے اعتبار سے ''جدید۔ ہندی اردو لغت'' اپنی نوعیت کی واحد لغت ہے جس میں قدیم و جدید ہندی کے الفاظ، ان کے تلفظات، ماخذ اور نحوی زمروں کے علاوہ معنی و مفہوم کو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ماہر لسانیات پروفیسر نصیر احمد خاں کی مرتب کردہ یہ لغت ایک مفید، کارآمد اور سنجیدہ تحقیق ہے جو اردو اور ہندی کے طلبہ کی بیشتر ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔

صفحات: 3383 (دونوں جلدیں)، قیمت -/1700 روپے (دونوں جلدیں)

اقبال کی کہانی (پچاس پیشکش)

مصنف: جگن ناتھ آزاد

اقبال کو عالمی ادب کے منظرنامے میں اہم مقام حاصل ہے۔ شاعرانہ کمالات کے علاوہ ان میں شگفتہ مزاجی بھی غضب کی تھی۔ ان کی علمی اور ادبی بحثوں میں بڑے باریک نکتے اور بذلہ سنجی پائی جاتی ہے۔ اقبال کو اپنے ملک و قوم کے بچوں کے مستقبل سے والہانہ لگاؤ ہی تھا جس کے سبب انھوں نے بچوں کے لیے بہت سی خوب صورت نظمیں لکھیں۔ ماہر اقبالیات جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی ہمہ گیر شخصیت کا جامع تعارف اس کتاب میں پیش کیا ہے۔

صفحات: 83، قیمت -/13 روپے

محمد نثار

پروفیسر بصیر احمد خاں سے گفتگو

● پروفیسر بصیر احمد خاں اندراگاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی میں آجکل بحیثیت پرو وائس چانسلر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس سے پہلے موصوف بمدرد یونیورسٹی میں تقریباً 16برسوں تک درس و تدریس کے علاوہ مختلف انتظامی عہدوں پر رہے مثلاً ڈین آف ویلفیر اسٹوڈنٹ لور پروکٹر۔ آپ کا تعلق ہمیشہ لکھنے پڑھنے سے رہا، آپ کی کئی تصانیف منظرعام پر آچکی ہیں۔ پچھلے دنوں جناب محمد نثار نے ان سے ایک خصوصی ملاقات میں **"اگنو اور اردو کا مستقبل"** کے حوالے سے گفتگو کی، جو قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔ ادارہ

سوال: آج اگنو (اندراگاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی) فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت بین الاقوامی شہرت کی حامل یونیورسٹی ہے۔ اس کی چند اہم خصوصیات پر روشنی ڈالنے کی زحمت کریں۔

جواب: جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان ایک ترقی پذیر ملک ہونے کے ساتھ ساتھ آبادی کے لحاظ سے دنیا کا دوسرا سب سے بڑا ملک ہے اور یہاں آج بھی خط افلاس سے نیچے زندگی گزارنے والوں کا تناسب تقریباً 23فیصد ہے جو زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم ہیں حکومت کی مختلف تعلیمی اسکیموں کے ذریعے تمام تر ممکنہ کوششوں کے باوجود شرح خواندگی میں کوئی قابل قدر اضافہ نہیں ہوا ہے اور آج بھی شہروں اور دیہی علاقوں میں لوگوں کی بڑی تعداد تعلیم سے محروم ہے۔ تعلیم یافتہ خواتین کا تناسب مردوں کے مقابلے میں افسوسناک حد تک کم ہے۔ ظاہر ہے اتنی بڑی آبادی کو رسمی نظام تعلیم کے ذریعے زیور تعلیم سے آراستہ کرنا ممکن نہ سہی مشکل ضرور ہے کیونکہ اس کے لیے جس بڑے پیمانے پر انفرااسٹرکچر اور دیگر لوازمات کی ضرورت ہے حکومت دستیاب کرانے سے قاصر ہے۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی جانب سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو تعلیم سے بہرہ ور کرانے کے سلسلے میں جو متعدد اسکیمیں چلائی جارہی ہیں اور جن کے مثبت نتائج بھی سامنے آرہے ہیں، ان میں فاصلاتی نظام تعلیم کا بہت نمایاں رول ہے اور آج اس نظام تعلیم کے ذریعے نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک تک لوگ کثرت سے مختلف شعبہ ہائے تعلیم میں ڈگریاں حاصل کرکے کامیاب ہورہے ہیں۔ جہاں تک اندراگاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کا تعلق ہے تو میں آپ کو بتادوں کہ آج یہ دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی اور فاصلاتی نظام تعلیم کا بین الاقوامی شہرت یافتہ ادارہ ہے۔ سردست یہاں 17لاکھ طلبہ رجسٹرڈ ہیں اور تقریباً 125 سے زیادہ کورسیز میں تعلیمی سہولتیں دستیاب ہیں۔ اگنو کے امتحانات کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی) حکومت ہند اور پوری دنیا کی یونیورسٹیوں اور حکومتی اداروں کی منظوری حاصل ہے۔ اگنو کے دو ہزار سے زیادہ اسٹڈی سینٹر ہیں اور تقریباً چالیس بیرونی ممالک میں اس کی شاخیں قائم ہیں۔ یہاں سے پورے ملک میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے۔ پورے ملک میں 48 ریجنل سینٹر ہیں۔ آج اگنو کی کامیابی سے متاثر ہوکر متعدد ریاستی یونیورسٹیاں فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت قائم ہورہی ہیں۔ فاصلاتی نظام تعلیم میں یونیورسٹی کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے اگنو کو ''کامن ویلتھ آف لرننگ ایوارڈ'' سے سرفراز کیا گیا ہے۔

سوال: یونیورسٹی میں زیر تعلیم طلبہ کسی طرح کی کمی محسوس نہ کریں۔ اس کے لیے یونیورسٹی نے کیا کیا طریقہ کار اپنا رکھا ہے، خاص طور سے درس و تدریس کے حوالے سے۔

جواب: موجودہ دور انفارمیشن ٹیکنالوجی کا دور ہے اور اس ٹیکنالوجی نے انسانی زندگی میں حیرت انگیز تبدیلیاں پیدا کردی ہیں۔ پوری دنیا آج سمٹ سمٹا کر ایک گاؤں میں تبدیل ہوچکی ہے اور برسوں کی مسافت کو ہم منٹوں اور سکنڈوں میں طے کرنے لگے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کے کسی بھی خطے میں رہ کر ہر وہ کام انجام دیا جاسکتا ہے جو کل تک محض ایک خواب و خیال تھا۔ جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے تو یونیورسٹی نے زیر تعلیم طلبہ و طالبات کے لیے وسیع پیمانے پر سہولتیں فراہم کی ہیں۔ تاکہ وہ کسی بھی مرحلے پر کسی طرح کی دشواری محسوس نہ کریں۔ ہم اپنے ریڈیو اور ٹی وی چینل کے ذریعے تعلیمی پروگرام چلاتے ہیں اس کے علاوہ سی ڈی، وی ہی آر، ٹیپ ریکارڈر، کیسٹ اور اسٹڈی میٹریل وغیرہ متعلقہ طلبہ کو فراہم کراتے ہیں، ٹیلی کانفرنسنگ کے ذریعے بھی تعلیم کی سہولت ہے ساتھ ہی ہر اسٹڈی سینٹر پر باضابطہ درس و تدریس کا نظم ہے جہاں طلبہ متعلقہ استاد سے رابطہ

قائم کر کے استفادہ کرتے ہیں۔ کچھ ایسے مضامین (Subjects) جن میں کلاس کرنا لازمی ہے ان کے لیے بھی باضابطہ نظم ہے۔ آپ کو میں یہ بھی بتادوں کہ طلبہ کو جو اسٹڈی میٹریل یونیورسٹی بھیجتی ہے اس کے لیے یونیورسٹی ہر سال 12 کروڑ روپے کا کاغذ خریدتی ہے۔

سوال: یونیورسٹی میں داخلے سے متعلق کیا کیا شرائط ہیں؟

جواب: یونیورسٹی میں داخلہ لینا کسی کے لیے بھی بہت سہل ہے کیونکہ یونیورسٹی میں داخلے سے متعلق شرائط وضوابط کو بہت ہی اوپن رکھا گیا ہے تاکہ کوئی بھی شخص جو حصول تعلیم کا خواہشمند ہے محض سخت ضوابط کے سبب حصول علم سے محروم نہ رہ جائے۔ دوسرے وہ سبھی طلبہ وطالبات جنھیں کسی کالج یا یونیورسٹی میں داخلہ نہیں مل سکا ہے، یا وہ لوگ جو کسی وجہ سے اپنی تعلیم مکمل نہیں کرسکے اور ایک مرتبہ پھر حصول تعلیم کے خواہشمند ہیں، اگنو میں داخلہ لے کر اپنا تعلیمی سفر جاری رکھ سکتے ہیں کیونکہ یونیورسٹی کے اولین مقاصد میں یہ بھی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ یونیورسٹی سطح کی تعلیم سے فیضیاب ہوں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ یونیورسٹی میں داخلہ لینا یقیناً بہت سہل ہے لیکن پاس ہونا اتنا سہل نہیں وہ اس لیے کہ یونیورسٹی کا اپنا ایک خاص معیار ہے اور یونیورسٹی اس معیار کو ہر حال میں قائم رکھنا چاہتی ہے۔ لہٰذا یونیورسٹی میں زیر تعلیم طلبہ طالبات سخت محنت کر کے ہی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں بصورت دیگر انھیں اپنے نتائج سے مایوسی ہوگی۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یونیورسٹی کے ذریعے تیار کردہ اسٹڈی میٹریل پوری دنیا میں قابل ستائش سمجھا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مختلف مقابلہ جاتی امتحانات میں شریک ہونے والے امیدوار دو کروڑ روپے کا ہر سال اسٹڈی میٹریل خریدتے ہیں۔ اس سے بھی یونیورسٹی کے معیار کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

سوال: اگنو میں مختلف علوم وفنون اور مختلف زبانوں میں اعلیٰ سطحی تعلیم کا نظم ہے لیکن اردو تعلیم کا کوئی باضابطہ نظم نہیں ہے، کیا مستقبل قریب میں اردو کے تعلق سے کچھ بہتری کے امکانات ہیں؟

جواب: یونیورسٹی کے قیام کے کچھ ہی دنوں بعد سے اردو بحیثیت اختیاری مضمون کے داخل نصاب ہے لیکن باضابطہ طور پر اردو میں اعلیٰ سطحی تعلیم کا اب تک کوئی نظم نہیں تھا آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ یہاں عنقریب باضابطہ طور پر اردو اور عربی کے کورس شروع کیے جانے والے ہیں اور اس سلسلے میں کارروائی تیز رفتاری سے جاری ہے۔ امید ہے کہ بہت جلد اس کے نتائج آپ کے سامنے ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ ان کورسیز کے شروع ہونے کی صورت میں سب سے زیادہ فائدہ عربی مدارس کے طلبہ کو ہوگا اور وہ مین اسٹریم میں شامل ہوسکیں گے۔

سوال: سچر کمیٹی رپورٹ کے تعلق سے آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

جواب: دیکھیے، سچر کمیٹی رپورٹ کے حوالے سے حکومت بہت سنجیدہ ہے اور مجھے پوری امید ہے کہ اس کے بہتر نتائج سامنے آئیں گے۔ سردست میں آپ کو بتادوں کہ وزارت تعلیم نے سچر کمیٹی رپورٹ کے تحت اگنو کو یہ ذمے داری سونپی ہے کہ تعلیمی اعتبار سے پسماندہ علاقوں میں اسپیشل اسٹڈی سینٹر کا قیام جلد از جلد عمل میں لایا جائے تاکہ ان علاقوں کا معیار تعلیم بلند ہوسکے۔ اس ضمن میں عربی مدارس میں بھی اگنو کے اسٹڈی سینٹر قائم کیے جارہے ہیں۔ کسی مدرسے کا کوئی سرپرست اساتذہ، صدر مدرس یا کوئی بھی ذمے دار شخص اپنے تعلیمی ادارے میں اگنو کا اسٹڈی سینٹر قائم کرنا چاہیے تو وہ حسب ذیل پتے یا ٹیلی فون نمبر پر رجوع کرسکتا ہے:

اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، میدان گڑھی، نئی دہلی 10068

فون: 91-11-29534215+(o) فیکس 91-11-29534186-

ای میل: bakhan@ignou.ac.in

سوال: کیا یہ نظام تعلیم طلبہ کو اساتذہ سے مکمل طور پر بے نیاز نہیں کردے گا؟

جواب: بالکل نہیں، وہ اس لیے کہ اتنی بڑی آبادی کو روایتی طرز تعلیم کے ذریعے تعلیم فراہم نہیں کرائی جاسکتی کیونکہ ہمارے پاس وسائل کا فقدان ہے۔ دوسرے گزشتہ چند برسوں میں جس سرعت کے ساتھ گرانی بڑھی ہے اور تعلیمی اخراجات میں مختلف سطحوں پر اضافہ ہوا ہے خاص طور سے پیشہ ورانہ تعلیم وغیرہ میں وہ عام شہریوں کی دسترس سے باہر ہے۔ انھیں اسباب کے پیش نظر اس نظام تعلیم سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جوڑنے کی کوشش کی جارہی ہے کیونکہ اس نظام تعلیم کے تحت ہر خاص وعام، عورت ومرد، امیر غریب خواہ اس کا تعلق شہر سے ہو یا دیہی علاقوں سے گھر بیٹھے بیٹھے بہت کم خرچ میں اپنا تعلیمی سفر بہتر ڈھنگ سے جاری رکھ سکتا ہے۔ عمر کی بھی قید نہیں ہے۔ جہاں تک طلبہ کو اساتذہ سے بے نیاز کرنے کی بات ہے ایسا کچھ بھی نہیں ہے بلکہ ہمارے اس نظام کے تحت طلبہ اساتذہ سے بالمشافہ ہوتے ہیں اور اپنے مسائل کا حل دریافت کرتے ہیں لہٰذا یہ کہنا کہ اس نظام کا مقصد طلبہ کو اساتذہ سے بے نیاز کرنا ہے، قطعی درست نہیں ہے۔

□□□

پتہ:

A-244, Munirka Village, New Delhi-110067

کاشف غزالی

امتحان کی تیاری کیسے کریں

امتحان میں اچھی پرفارمنس محض چند دنوں کی تیاری سے ممکن نہیں۔ سال بھر کی منصوبہ بند اور مستقل کوششیں اس کے لیے ضروری ہیں۔ جوں ہی کالج میں داخلہ ہوجائے اس کے لیے کوشش درج ذیل خطوط پر ہونی چاہیے۔

اہداف کا تعین: واضح اہداف طے کیجیے۔ اس سال مجھے ڈسٹنکشن حاصل کرنا ہے۔ فزکس میں اپنی پرفارمنس کم سے کم 60 فیصد نشانات کی صلاحیت تک بڑھانی ہے۔ انگریزی لکھنے کی صلاحیت بڑھانی ہے۔ اپنے حالات، گذشتہ پرفارمنس اور اپنی امنگوں کو پیش نظر رکھ کر قابل عمل ہدف طے کر لیجیے۔ اس ہدف کے حصول کے لیے واضح منصوبہ بھی بنا لیجیے۔ کس مضمون کے لیے کتنا وقت دیں گے، کس وقت پڑھیں گے؟ کیا پڑھیں گے؟ پڑھائی کا شیڈول کیا ہوگا؟ ان اور ان جیسے اور کئی سوالات کے متعین جواب آپ کے منصوبے کی تشکیل کریں گے۔ منصوبہ قابل عمل بنائیے۔ اپنی ضروریات اور مشاغل کا بھرپور لحاظ رکھیے۔

1. روزانہ کام: روز کام کیجیے خواہ تھوڑا ہی سہی۔ اپنے دن بھر کے اوقات کو اچھی طرح منضبط کیجیے۔ کھیل کود اور تفریحات کے اوقات بھی طے ہونے چاہئیں۔ سال کے آغاز ہی سے اگر آپ یہ طے کرلیں کہ آپ کا کوئی دن امتحان کے نقطۂ نظر سے بے کار نہیں گزرے گا تو آپ اپنا کورس بہ آسانی مکمل کرسکتے ہیں۔

2. کورس مکمل کیجیے: سال بھر کے عرصے کے دوران پورا کورس پڑھ ڈالیے۔ اگر آپ نے محض کورس کا ایک حصہ پڑھ لیا ہے، یا امتحان پرچے میں انتخاب (Choice) کی سہولت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ اسباق چھوڑ دیے ہیں تو آپ کی کارکردگی متاثر ہوگی۔ اعتماد میں کمی آئے گی۔ اکثر اوقات تمام اسباق ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔ اس لیے چند اسباق کی لاعلمی دوسرے اسباق کے سلسلے میں کارکردگی کو بھی متاثر کرتی ہے۔ اس کا مؤثر طریقہ یہ ہے کہ سال کے شروع ہی میں آپ سرسری طور پر پورا کورس پڑھ ڈالیں۔ پھر پورے سال کلاس روم میں ہو رہے اسباق کے ساتھ ساتھ ذاتی طور پر بھی گہرائی سے مطالعہ کرلیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ کلاس روم میں لیکچر جب آپ سنیں گے تو اس سے کسی حد تک پہلے سے آپ واقف ہوں گے۔

3. نوٹس (Notes) بنائیے: جو کچھ آپ نے پڑھا ہے اس کے نوٹس بنائیے۔ نوٹس کا مقصد یہ ہو کہ ان کی وجہ سے آپ کو بار بار پورا کورس یا ضخیم کتابیں نہ پڑھنی پڑیں بلکہ پڑھی گئی کتابیں اور ان کے مشمولات نوٹس کی مدد سے بہ آسانی ذہن میں تازہ کیے جاسکیں۔ یاد رکھیے کتابوں کے بغیر صرف نوٹس کی مدد سے پڑھنا ایک اچھے طالب علم کا شعار نہیں ہوسکتا۔ پہلے کتابیں پڑھیے۔ ریفرنس بکس پڑھیے۔ اس کے بعد اپنے نوٹس خود تیار کیجیے۔ دوسروں کے تیار کردہ نوٹس آپ کے لیے کسی حد تک فائدہ مند تو ہوسکتے ہیں لیکن اگر صرف ان نوٹس کی مدد سے ہی آپ پڑھنا چاہیں تو یہ آپ کے لیے نقصان دہ ہوگا۔

نوٹس نکالنے کی ایک شکل سوالات و جوابات کی صورت میں ہوسکتی ہے۔ یہ بھی مفید طریقہ ہے۔ تمام ممکنہ سوالات کا اندازہ قائم کیجیے اور ان کے بہتر سے بہتر جوابات لکھیے۔ ان جوابات میں پورے کورس کا احاطہ ہونا چاہیے۔

مشکل حصے اور ایسے حصے جن کو یاد رکھنا دشوار ہے، انھیں نشان زد کردیجیے تاکہ بار بار ان پر نظر پڑتی رہے۔ ایک چھوٹی نوٹ بک میں نکات، اہم فارمولے، تاریخیں، ڈائاوغیرہ قسم کی چیزیں الگ سے لکھتے رہیے تاکہ اسے بار بار یاد کیا جاسکے اور امتحان سے قبل اعادہ کیا جاسکے۔ ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان نکات کے چارٹس بنا کر آپ اپنے اسٹڈی ٹیبل کے سامنے چسپاں کرلیں۔

4. معلومات بڑھائیے: درسی کتاب (Text Books) کا مطالعہ کیجیے۔ حوالہ جاتی کتابوں کا مطالعہ آپ کی معلومات میں پختگی پیدا کرے گا اور آپ کو اس قابل بنائے گا کہ آپ مشکل سے مشکل سوال کو آسانی سے حل کرسکیں۔ حوالہ جاتی کتابوں کے علاوہ علمی جریدوں کا مطالعہ بھی کیجیے۔ آج کل ہر معیار کے طلبہ کے لیے جرائد نکل رہے ہیں۔ حتیٰ کہ اسکول کے طلبہ کے لیے بھی ان کے کورس سے متعلق جرائد کئی مقامات سے جاری ہیں۔ ان کا بھی گہرائی سے مطالعہ کیجیے۔

5. مباحثے اور گفتگو: جو کچھ آپ نے پڑھا ہے اسے دوستوں کے درمیان زیر بحث لائیے۔ یاد رکھیے اظہار (Expression) معلومات کو راسخ کرنے اور اچھی طرح ذہن نشین کرنے کا بہت مؤثر طریقہ ہے۔ یہ مباحثے غیر رسمی بھی ہوسکتے ہیں اور کچھ ہم جماعت باہم مل کر رسمی اور باقاعدہ مباحثوں کا نظام بھی قائم کرسکتے ہیں۔

اپنے سے زیادہ ذہین طالب علم سے گفتگو اور مباحثے کیجیے۔ اپنے کمزور دوستوں کو پڑھائیے۔ پڑھانے سے بھی مواد اچھی طرح ذہن نشین ہوجاتا ہے۔ بہرحال اپنی سہولت اور احوال کے مطابق پڑھے گئے مواد کے اظہار کا

کوئی مؤثر نظام ضرور قائم کیجیے۔

6. مشق اور رفتار میں اضافہ: اچھی معلومات بھی بسا اوقات اچھے جوابات کی شکل اختیار نہیں کر پاتیں۔ امتحان میں اچھی کارکردگی اچھی معلومات کے ساتھ بعض دیگر عوامل پر بھی منحصر ہے۔ ان عوامل پر قدرت حاصل کرنے کے لیے مستقل مشق ضروری ہے۔

اس کے لیے پچھلے امتحانی پرچوں کو حل کیجیے۔ پہلے اپنے طریقے سے حل کیجیے۔ پھر باقاعدہ وقت نوٹ کر کے متعین وقت میں حل کیجیے۔ کوشش کیجیے کہ امتحان سے قبل ہر مضمون کے کم سے کم 5 پرچے آپ متعین وقت میں حل کرلیں۔ اس سے آپ کا اعتماد بھی بڑھے گا اور مشق بھی ہوگی۔ امتحان میں وقت کی بڑی اہمیت ہے۔ متعین وقت میں پرچہ حل کرنے کے لیے آپ کو لکھنے کی اور سوچنے کی رفتار بڑھانی ہوگی۔ امتحانی پرچوں کا حل اس سلسلے میں آپ کی مدد کرے گا۔

آخری لمحات میں امتحان کی تیاری: لیجیے امتحان سر پر آگیا ہے۔ اگلے روز امتحان ہال میں بیٹھنا ہے اور مشکل سوالات سے مقابلہ کرنا ہے۔ کیا ان نازک گھڑیوں میں بھی کوئی تیاری ممکن ہے؟ کیا ان اوقات میں کورس کو دوبارہ پڑھنا چاہیے؟ گہرا مطالعہ کرنا چاہیے؟ مشق کرنی چاہیے؟ یہ آخری گھڑیاں بھی طالب علم کے لیے بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ ان کا ذہانت کے ساتھ استعمال امتحان میں بہت اچھی کارکردگی کا باعث بن سکتا ہے۔

1. اعادہ: پورے کورس کا اعادہ کیجیے۔ اپنے نوٹس پڑھ ڈالیے۔ جہاں ممکن ہو کتابوں کی طرف بھی ہلکی سی نظر ڈالیے۔

2. اہم حصے: نوٹس کے اہم حصوں کو بار بار پڑھیے۔ جن مشکل مقامات کو آپ نے نشان زد کر رکھا ہے ان کو قدرے گہرائی کے ساتھ اور تواتر کے ساتھ پڑھیے۔ ممکن ہو تو انھیں ایک بار زبانی لکھ ڈالیے۔

3. باریک تفصیلات: اہم تاریخیں، اہم اشخاص کے نام، متن کے اہم حصے، اشعار، فارمولے، اہم اصطلاحات، اہم اعداد و شمار اور ڈاٹا وغیرہ۔ یہ سب چیزیں امتحان میں ضروری ہیں اور ان کے بھول جانے کے امکانات بھی بہت زیادہ ہیں۔ بسا اوقات ایک چھوٹا سا فارمولا آپ بھول جاتے ہیں اور آپ کا سارا پرچہ خراب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ان پر نظر رکھیے۔ ان تفصیلات کو آپ پہلے ہی چھوٹی ڈائری میں نوٹ کر چکے ہیں۔ ان کا اچھی طرح اعادہ کر لیجیے۔ بار بار یاد کیجیے۔ لکھ کر جانچ کیجیے۔

4. سرسری نظر: ایک بار پورے کورس پر سرسری نظر (Scanning) ڈال لیجیے۔ باریک سے باریک تفصیل کو دیکھ لیجیے۔ دیکھ لیجیے کہ کوئی چیز چھوٹ تو نہیں گئی؟ یا کوئی چیز نظروں سے اوجھل تو نہیں ہوگئی؟ Scanning کا یہ عمل امتحان کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس پر بھرپور توجہ دیجیے۔

5. سوالیہ پرچوں پر نظر: ایک بار پورے کورس کو ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ سوالیہ نوٹس کے صرف سوالات کو دیکھ لیجیے۔ سوالیہ پرچے دیکھ لیجیے۔

6. سکون: یہ سارے کام امتحان سے تین گھنٹے قبل مکمل کر لیجیے۔ اس کے بعد کتابیں لپیٹ دیجیے۔ ٹھنڈا پانی پی لیجیے اور ذہن کو آرام دیجیے۔ یاد رکھیے آخری لمحات تک ذہن کو مصروف رکھنا امتحان میں خراب کارکردگی کا باعث بن سکتا ہے۔ اگر آپ امتحان میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں تو امتحان سے قبل ذہن کو سکون دیجیے۔

امتحان ہال میں: بہت سکون کے ساتھ امتحان کے لیے نکلیے۔ دو رکعت نماز ادا کیجیے۔ ٹھنڈا پانی پی لیجیے۔ ذہن کو اب سوالات میں الجھنے مت دیجیے۔ دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرتے ہوئے، ہلکی پھلکی گفتگو کرتے ہوئے امتحان گاہ کی طرف جائیے۔ امتحان گاہ میں صبر و سکون کے ساتھ داخل ہوئیے۔ تمام قواعد کی پابندی کیجیے۔

1. پرچۂ سوالات پڑھ لیجیے: مکمل طور پر سوالات پڑھ لیجیے۔ اس کام کو بہت اطمینان اور صبر و سکون کے ساتھ انجام دیجیے۔

2. جواب کو تولیے: اگر سوالات میں سے انتخاب کرنا ہے، جوابات ذہن میں تازہ کیجیے۔ مختلف سوالات کا موازنہ کیجیے۔ اندازہ کیجیے کہ کس سوال کا جواب بہتر ہوگا۔ اس کام میں تھوڑا وقت صرف کیجیے اور مناسب سوالات کا انتخاب کیجیے۔

3. جواب کی منصوبہ بندی: سوال پڑھتے ہی جواب شروع نہ کر دیجیے بلکہ اپنے ذہن میں جواب کا خاکہ بنائیے۔ کیا نکات ہوں؟ کس ترتیب کے ساتھ ہوں؟ کس نکتے کی وضاحت کے لیے کتنی سطریں لکھی جائیں؟ اگر تکنیکی سوال ہو تو اس کے حل کا کیا طریقہ ہو؟ کون سے فارمولے اختیار کیے جائیں؟ کیا یہ سب یاد ہیں؟ وغیرہ۔ جواب کا مکمل خاکہ بنانے کے بعد جواب لکھنا شروع کیجیے۔ ضرورت ہو تو خاکہ بنانے کے لیے پوائنٹس لکھنے کے لیے رف (Rough) جگہ کا استعمال کیجیے۔

4. جواب کو سجائیے: اپنے جواب کو زیادہ واضح اور خوبصورت بنائیے۔ اس کے لیے جہاں ضرورت ہو پیراگراف بنائیے۔ بعض امور نمبروار درج کیجیے Mathematical Step کو نمبر دیجیے۔ نقش Diagram وغیرہ کی ضرورت ہو تو وہ بنائیے۔ گراف بنائیے۔ ٹیبل بنائیے۔ تاریخیں لکھیے۔ حوالے دیجیے۔ یہ سب چیزیں معلومات کی پختگی اور اظہار پر قدرت ظاہر کرتی ہیں اور امتحان میں درحقیقت انھی اوصاف کی آزمائش مقصود ہوتی ہے۔

5. صفائی اور خوبصورتی: صاف ستھرے اور خوبصورت طریقے سے

لکھیے۔ کاٹ چھانٹ سے پرہیز کیجیے۔ حاشیہ چھوڑیے۔ اشکال، گرافس وغیرہ میں صفائی کا خصوصی طور پر لحاظ رکھیے۔

6. وقت پر کنٹرول کیجیے: وقت پر کنٹرول کے لیے پہلے سے Calculation کرکے منصوبہ بندی کر لیجیے۔ اگر تین گھنٹوں میں 6 سوال حل کرنے ہیں تو 15 منٹ سوالات کے مطالعے اور انتخاب کے لیے درکار ہیں۔ آخر کے 15 منٹ اعادے کے لیے درکار ہیں۔ اس طرح ہر سوال کے لیے 25 منٹ بچتے ہیں۔ ان میں سے 5 منٹ جواب کی منصوبہ بندی کے لیے اور 2 منٹ جواب کے اعادے کے لیے درکار ہیں۔ 18 منٹ میں ایک سوال آپ کو حل کرنا ہوگا۔ مشکل سوالات کے لیے آپ کچھ زیادہ وقت صرف کر سکتے ہیں لیکن اس صورت میں آسان سوالات سے وقت بچانا پڑے گا۔

7. اعادہ کیجیے: پرچہ حوالے کرنے سے پہلے اعادہ کرنا قطعاً نہ بھولیے۔ پورے پرچے پر نظر دوڑایئے۔ اہم اور فیصلہ کن مرحلوں پر خصوصی نظر رکھیے۔ فارمولوں وغیرہ کو چیک کر لیجیے۔ Calculation کو چیک کر لیجیے۔ جہاں جہاں غلطی کا امکان ہوسکتا ہے، ایسے مقامات کا زیادہ توجہ کے ساتھ اعادہ کیجیے۔ کل وقت کا کم سے کم 1/10 حصہ، اعادے کے لیے مختص ہونا چاہیے۔

اس طرح مذکورہ بالا طریقوں کو اختیار کرکے امتیازی نمبر حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

□□□

پتہ:
1071, Haveli Anwar Ali,
Near Suiwalan,
Bazar Chitli Qabar,
Jama Masjid, Delhi-110006

فانی بدایونی (جدید ایڈیشن)

مصنف: مغنی تبسم

اردو غزل کے احیائے جدید میں فانی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے اس کتاب میں فانی کی حیات، شخصیت اور شاعری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ موصوف نے فانی کے ناقدین و محققین، عزیز و اقارب، احباب اور جاننے والوں سے شخصی ربط پیدا کرکے ان سے متعلق اہم معلومات یکجا کردی ہے اور شاعر کے فن کے تجزیے کے لیے لسانیات کی اہم شاخ ''اسلوبیات'' کے ذریعے کلام فانی کے صوتی آہنگ کا دلچسپ مطالعہ کیا ہے جو اردو شعر و ادب میں اپنی نوعیت کی پہلی باضابطہ کوشش ہے۔

صفحات: 499، قیمت: -/210 روپے

مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے

مصنف: مرزا محمد زماں آزردہ

مرزا سلامت علی دبیر انیسویں صدی کے ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے مرثیہ گوئی کو ایک نئی تب و تاب عطا کی اور ایک مقبول و دلچسپ سے ہم کنار کیا۔ ان پر ابھی تک جو کچھ بھی تحقیقی مواد فراہم ہوسکا ہے وہ بڑی حد تک تشنہ ہے۔ اس کتاب میں دبیر کے حالات زندگی، شعری کارنامے، مراثی کی روایت، کلام دبیر کی اہم خصوصیات، ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی نشاندہی اور ان کے ادبی مرتبے کے تعین کے ذریعے اس تحقیقی کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

صفحات: 592، قیمت: -/258 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

فاروق احمد

دسویں کے بعد کیا کریں؟

زندگی میں مناسب وقت پر مناسب فیصلہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ کئی بار زندگی میں ایسے مواقع آتے ہیں۔ جب ہمیں یہ احساس شدت سے ہوتا ہے کہ ہمارا پیشہ ہماری صلاحیت کے مطابق نہیں ہے۔ یا کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ والدین کی خواہش پر ڈاکٹر تو بن گئے لیکن طبیعت شعروشاعری کی طرف سے مائل ہے اور دلچسپی تصنیف وتالیف میں ہے۔ اسی طرح ایک قابل انجینئر ہونے کے باوجود اداکاری میں دلچسپی انجینئر سے اداکار بنا دیتی ہے۔ ایسی کئی مثالیں مل جائیں گی۔ جہاں لوگ اپنا خاندانی کاروبار سنبھالنے لگتے ہیں، لیکن ان کی دلچسپی کسی اور شعبے میں ہوتی ہے، وجہ ہے اپنی قابلیت سے ناواقفیت یا پھر مجبوری میں نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کرنا (یعنی ایسے Stream اور Subjects کا انتخاب کرنا) جس کی طرف دلی رجحان نہ ہو یا پھر رہنمائی کی کمی۔ ایسی حالت میں ترقی کے امکانات کم ہوجاتے ہیں۔ یہ بات اور ہے کہ پیشہ اور شوق میں بہت فرق ہوتا ہے۔ لیکن شوق کو ہی اگر اپنا کیریئر بنالیا جائے تو ظاہر ہے کہ ترقی میں مزید اضافہ ہوگا اور قلبی اطمینان بھی حاصل ہوگا۔ اس لیے اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے یہ ضروری ہے کہ والدین کچھ باتوں کا خاص خیال رکھیں۔

بچوں کی رہنمائی کریں: بچوں کو زندگی میں کچھ کر گزرنے کا حوصلہ دینا ہی کافی نہیں ہے۔ انھیں آزاد کرنا زیادہ ضروری ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب مناسب وقت پر مناسب رہنمائی کی جائے۔ پہلے کے زمانے میں لوگ اپنے بچوں کے مستقبل کے تئیں اس قدر سنجیدہ نہیں رہا کرتے تھے۔ لیکن آج وقت بدل گیا ہے۔ قدم قدم پر مقابلہ آرائی میں اضافے نے ہمیں ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانے پر مجبور کردیا ہے۔ اسی لیے آج کیریئر کاؤنسلرس (Career Councillors) کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے۔

غور کریں: کسی بھی Stream اور Subject کے انتخاب سے پہلے آپ اس بات پر غور کریں کہ:

آپ کی دلچسپی کس میں ہے؟

جس Stream کو آپ منتخب کررہے ہیں، کیا اس کے متعلق آپ کو مکمل واقفیت ہے؟

جس Stream کا آپ انتخاب کررہے ہیں، کیا اس سے حاصل ہونے والے فوائد یا مستقبل میں کس پیشہ کو اختیار کرسکتے ہیں، اس بات سے واقف ہیں؟

جس Stream کا آپ نے انتخاب کیا ہے، مستقبل میں اس کی تعلیم کے لیے کہاں اور کس طرح کا انتظام ہے، کیا اس کی جانکاری آپ کو ہے؟

اگر نہیں، تو آیئے ہم آپ کو ان تمام باتوں کی مکمل جانکاری دیتے ہیں۔

یہ یاد رہے کہ ہر اسکول وکالج میں تین Stream ہوتے ہیں۔ سائنس، کامرس اور آرٹس، انھیں میں سے کسی ایک کو دسویں کے بعد آپ کو منتخب کرنا پڑتا ہے۔ آپ کیا بننا چاہتے ہیں اور جو بننا چاہتے ہیں، اس کے لیے کون سے Stream اور Subjects ضروری ہیں؟ انھیں ذہن نشین کرلیں۔

سائنس: اگر آپ کا رجحان سائنس کی طرف ہے تو پہلے یہ جان لیجیے کہ سائنس میں بھی کون کون سے مضامین ہوتے ہیں؟ اس میں آپ کو علم طبیعات (Physics)، علم کیمیا (Chemistry) اور علم الحساب (Mathematics) یا عالم الحیات (Biology) میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔

یعنی PCM (فزکس، کیمسٹری، میتھمیٹکس)

PCB (فزکس، کیمسٹری، بائیولوجی)

کیمیکل سائنس (یعنی PCB): Chemical Sience کی اہمیت صنعت وحرفت میں ہے۔ جیسے پٹرولیم، ربڑ، پلاسٹک، پرفیوم، نیکسائل، صابن، پینٹ، دوائیاں، فوڈ پروڈکٹس وغیرہ۔ روزمرہ کے استعمال کی ایسی کئی چیزیں ہیں، جن کی تیاری کیمیکل سے ہوتی ہے۔ کیمسٹری میں کسی بھی چیز کی کمپوزیشن (اجزائے ترکیبی) ساخت (Structure) اور دوسری چیزوں کے ساتھ اس کے تعمل کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

علم الحیات (لائف سائنس): اگر آپ کو فطرت (Nature) و نباتات سے بے حد لگاؤ ہے یا آپ انسانی جسم کے بارے میں مطالعہ کرنے کے خواہش مند ہیں۔ تو یہ Subject آپ کے لیے موزوں ہے۔ اس کے لیے آپ کو Biology کا انتخاب کرنا پڑے گا۔

لائف سائنس میں آپ مندرجہ ذیل مضامین کا مطالعہ کرسکتے ہیں:

1. Botany (یعنی پیڑ پودوں کا مطالعہ)
2. Zoology (یعنی جانوروں کا مطالعہ)
3. Bio-Technology
4. Genetics
5. Microbiology

ایگریکلچر سائنس: ہندوستان کی معیشت کا انحصار زراعت پر ہے۔

زیادہ تر کچے مال(Raw Materials) کا حصول زراعت سے ہی ہوتا ہے۔ اس میں بھی آپ کے پاس کئی متبادل ہیں۔ مثلاً

1. Cultivation
2. Floriculture
3. Horticulture
4. Dairy Technology اور Poultry Farming

ارتھ سائنس: اس میں آپ نظام شمسی کے تیسرے سیارہ زمین، جس پر آپ بستے ہیں، کے بارے میں پوری جانکاری حاصل کر سکتے ہیں یعنی زمین، پانی وغیرہ کا ارتقا اور اس کی دریافت سے متعلق تفصیلی معلومات اس کے تحت مندرجہ ذیل متبادل ہیں:

1. Oceanography
2. Geology
3. Geography
4. Meteorology

ہوم سائنس: اس میں Textiles, Nutrition, Food Science اور Clothing وغیرہ آتے ہیں۔

میڈیسین: بائیلوجی کا انتخاب کرکے آپ ڈاکٹر بن سکتے ہیں جیسے ایلوپیتھک، ہومیوپیتھک، آیورویدک، یونانی وویٹرنری وغیرہ۔

آپ چاہیں تو الگ الگ شعبوں کے ماہر بن سکتے ہیں۔ مثلاً جنرل فزیشین، ڈنٹسٹ، آرتھو پیڈک، پیڈیاٹریشین، آئی اسپیشلسٹ، ENT اسپیشلسٹ، گائنا کولاجسٹ، نیورولوجسٹ وغیرہ۔

پیرا(PARA) میڈیسین: اس میں مندرجہ ذیل متبادل ہیں۔

1. Physiotherapy
2. Occupational Therapy
3. Speech Therapy
4. Lab Technology
5. Pharmacy
6. Nursing وغیرہ۔

فزیکل سائنس: اس میں کائنات (Universe) کے بارے میں تفصیلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس میں سیاروں کی رفتار، خلا کا مکمل مطالعہ، نئی چیزوں کی دریافت، نظام شمسی، فضا کی کیفیت و رفتار اور ان کے Role وغیرہ کے بارے میں مکمل جانکاری ملتی ہے۔ فزیکل سائنس کے لیے علم الحساب (Mathematics)، علم طبیعات (Physics) اور اعداد و شمار (Statistics) کے بارے میں گہرا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ اس میں یہ مضامین آتے ہیں:

1. Physics (علم طبیعات)
2. Astronomy (علم نجوم)
3. Ganit (علم الحساب)

انجینئرنگ: انجینئرنگ کے لیے آپ کو سائنس اور علم الحساب کا انتخاب کرنا پڑے گا۔

یہ سائنس اور حساب کے اصول، تخمینے اور تجربے پر مشتمل ہے۔ اس میں ان نئی نئی تکنیکوں کا علم ہوتا ہے، جن کے ذریعے ہم اپنی روزمرہ کی زندگی کو مزید آسان بنا سکتے ہیں۔

انجینئرنگ میں بھی کئی طرح کے کام ہیں۔ جیسے Development "Research" Design "Analysis" وغیرہ۔

انجینئرنگ میں پانچ خاص شعبے ہیں۔

1. Chemical
2. Civil
3. Electrical
4. Industrial اور
5. Mechanical

اس کے علاوہ بھی کچھ خاص شعبے ہیں۔ مثلاً Bio-medical "Aerospace", "Ocean", "Nuclear" اور Enviromental انجینئرنگ۔

علاوہ ازیں "Computer Science, Statistics, Mathematics, Architecture, Pharmacy Technical Diploma وغیرہ کیا جا سکتا ہے۔

چند مزید متبادل: سائنس میں چند دوسرے متبادل بھی ہیں، جن کا فائدہ آپ کو درجہ دوازدہم (بارھویں) کے بعد ملتا ہے۔

مثلاً:

1. Indian Armed Forces
2. Merchant Navy
3. Commercial Pilot
4. Graduate Diploma Programme in Design - National Institute of Design (NID).
5. Bachelor of Management Studies (BMS)

6. Bachelor of Mass Media (BMM)
7. Bachelor of Computer Application (BCA)
8. Information Technology (IT)

وغیرہ۔

جنرل: کچھ کیریئر ایسے ہیں، جن پر مضامین کی کوئی قید نہیں ہے۔ یعنی آپ جن Subjects کا بھی انتخاب کریں ان کیریئر کو اپنی منزل بنانے میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ مثلاً

1. Hotel Management
2. LAW
3. Journalism
4. Diploma/Degree in Foreign Languages
5. UG in Design/UG in Tech-National Institute of Fashion Technology.

Arts And Humanities: سب سے پہلے تو یہ جان لیں کہ Arts Stream کا انتخاب کرنے پر آپ کو کون کون سے Subjects پڑھنے ہوں گے اور ان میں کس مضمون کا انتخاب کر سکتے ہیں؟

سوشل سائنس: اس میں سماج سے منسلک ہر پہلو کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ خاص طور سے انسانی سلوک (Human Behaviour) اور گروہ کے درمیان کے تعلقات کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔

انتھروپولوجی: اپنے بارے میں مزید جاننا، انسان سے منسلک خوبیاں، انسانی ترقی سے متعلق باتیں دنیا بھر میں رہنے والے لوگوں کے رہن سہن، بناوٹ، ان کی زبان وبیان کی خوبیوں سے متعلق مطالعہ Anthropology کہلاتا ہے۔

آرکیالوجی: اگر آپ ماضی کے بارے میں جانکاری حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آرکیالوجی (Archaeology) آپ کے لیے بہترین Subject ہے۔ یہ بہت دلچسپ بھی ہے۔ زمانہ قدیم میں لوگ کیسے رہتے تھے، ان کا رہن سہن، سماجی زندگی، خوراک، طرز زندگی وغیرہ۔ مثلاً ہم وادیٔ سندھ کی تہذیب کے بارے میں پڑھ چکے ہیں۔ اسی سے متعلق دیگر۔

تاریخ: کس نے، کب، کہاں اور کیسے حکومت کی؟ حکومت کیسی رہی؟ ان کے دور حکومت سے منسلک تمام اہم واقعات کی جانکاری کا نام تاریخ (History) ہے۔ خصوصاً بہادر حکمرانوں، جنگجوؤں، عظیم اور قابل ذکر شخصیات سے متعلق معلومات کا نام تاریخ ہے۔

فلسفہ: فلسفہ یعنی Philosophy درحقیقت سچ، حقیقت اور وجود سے منسلک باتوں کی جانکاری کا نام ہے۔

قانون: اگر آپ میں بحث ومباحثہ کرنے کی صلاحیت ہے اور اپنی باتوں کو ثابت کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ تو آپ کو قانون (LAW) کا انتخاب کرنا چاہیے۔ اپنے حقوق اور قانون سے متعلق تمام جانکاریاں اس میں دستیاب ہیں۔ مستقبل میں اس کے لیے سنہرے مواقع ہیں۔

پالیٹیکل سائنس: اگر آپ کا رجحان سیاست کی طرف ہے تو آپ کو اس Subject کا انتخاب کرنا چاہیے۔ سیاست سے متعلق پوری جانکاری ہی پالیٹیکل سائنس ہے۔ اس کے تحت سیاست کی ابتدا، ارتقا، حکومت، حکومت کی پالیسی، لیڈر، سیاسی فیصلے سے متعلق باتوں کا مطالعہ کرنے کو ملتا ہے۔

سائکولوجی: انسانی دماغ، سلوک اور اس کی سوچ وفکر کو سمجھنا ہی سائکولوجی (Psychology) یعنی علم نفسیات کہلاتا ہے۔ انسان کی یادداشت، جذبات وخیالات وغیرہ کا مطالعہ کرنا۔ یہ سب سائکولوجی کا حصہ ہے۔

Humanities: اگر آپ تہذیب وثقافت اور فنون لطیفہ میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ تو اس کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ اس میں ڈرائنگ، مصوری، فنون لطیفہ اور رقص وسرود وغیرہ سے منسلک چیزیں شامل ہیں۔

ادب (Literature): عظیم ادبا، شعرا و نقادوں کی تخلیقات خواہ وہ غزل ونظم ہو یا کہانی، ڈرامہ ہو یا افسانہ مضمون (مقالہ) ہو یا پھر ناول۔ ان سب کا گہرائی وگیرائی سے تفصیلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔

Linguistics: اس کے تحت زبان کا سائنسی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ زبانوں کا آغاز، دوسری زبان سے تعلق، وقت کے ساتھ زبان میں ہونے والی تبدیلی اور زبانوں کو کیسے سیکھا جائے، یہ سب بھی اسی کے تحت سیکھا جاتا ہے۔

پیشہ ورانہ متبادل: اگر آپ Arts کا انتخاب کرتے ہیں، تو مندرجہ ذیل پیشہ ورانہ متبادل ہو سکتے ہیں۔

1. Languages
2. Public Relations
3. Journalism
4. Advertising
5. Hotel Management
6. Designing (Fashion, Jewellery, Interior)
7. B.Ed. (Teaching)
8. Special Education
9. Travel & Tourism

10. B. Lib (Library Science)
11. Social Work
12. B.M.S. (Bachelor of Management Studies)
13. M.M. (Bachelor of Mass Media)
14. Programme in Design (National Institute of Design)
15. UG in Design (National Institute of Fashion Technology).

وغیرہ۔

کامرس یا منی میٹر: کامرس میں کاروبار اور مالیات (Finance) سے متعلق جانکاری فراہم کی جاتی ہے۔ مثلاً کسی شے کی خرید وفروخت اور پھر اس سے فائدہ اٹھانا۔ اسی کی بنا پر ہماری موجودہ کاروباری تنظیمیں کھی ہوئی ہیں۔ کامرس میں آپ مندرجہ ذیل مضامین کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

چارٹرڈ اکاؤنٹینسی (رقم کا حساب وکتاب): ہر فرد کماتا ہے اور کئی جگہوں پر خرچ کرتا ہے۔ تو رقم کا پورا حساب وکتاب، اسے Varify اور Analyse کرنا، رقم سے متعلق معاملات کو سلجھانا، یہ سب Chartered Accountancy میں آتا ہے۔ مستقبل میں اس کے لیے کافی اچھے مواقع موجود ہیں۔

کمپنی سکریٹری شپ (جس میں سکریٹری ہی پاس ہوتا ہے): کمپنی سکریٹری کسی بھی کمپنی کے لیے مقرر ہو سکتے ہیں۔ ان کا کام کمپنی کو ٹھیک ڈھنگ سے Guide کرنا اور ان کے قانونی (Legal) معاملات کو حل کرنا ہے۔ اس کے لیے مطلبیل ڈسپلن لا، مینجمنٹ، فائنانس اور کارپوریٹ گورنینس کا علم ہونا ضروری ہے۔

Cost & Work Accounts: سیدھے سادے الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ ان کا خاص کام بجٹ کو کنٹرول کرنا، Project کی منصوبہ بندی (Planning) کرنا، کسی بھی Product کی حتمی قیمت طے کرنا وغیرہ ہے۔ یہ ٹیکس Consultant اور کمپنی کے معاملات کے لیے مشیر وغیرہ بن سکتے ہیں۔

Chartered Financial Analyst (The Financial Backbone of Company): یہ Corporate Finance اور Investment Management اور Financial Services میں ایک طرح کا Training Programme ہے۔ Insurance اور Banking Corporate Sectors میں ان کی کافی مانگ (Demand) ہے۔

اگر آپ کامرس Stream کا انتخاب کرتے ہیں، تو آپ کے پاس مندرجہ ذیل متبادل ہیں۔

1. Chartered Accountancy.
2. Cost & Work Accounts.
3. Law & Banking

(بشکریہ: ہندی ماہنامہ "میری سہیلی" شمارہ مارچ 2007)

□□□

پتہ:
82, Hospital Road,
Kamarhatty Sharif, Kolkata-700058

شعر، غیر شعر اور نثر

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال انگیز مضامین کا یہ مجموعہ پہلی بار 1973 اور دوسری بار 1998 میں شائع ہوا تھا۔ اس میں شامل مضامین نے تفہیم شعر و ادب کی نئی راہیں کھولیں۔ یہ اس اہم کتاب کا تازہ ترین ایڈیشن ہے جس میں "پس نوشت: آج یہ کتاب" کے عنوان سے ایک نئے مضمون کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔ جدید ادب اور جدیدیت کی تفہیم نیز کلاسیکی ادب کی فہم و بازیافت دونوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

ڈیمائی سائز، صفحات: 528، قیمت -/228 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

دھریندر سنگھ جفا (ہماری مطبوعات سے)

ہمت اور بزدلی

ایک برس بعد جب ایک روز وکرم اپنے دیش، اپنے شہر اور اپنے گھر کے اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا، ہندوستانی ایئرفورس کی جگمگاتی وردی میں ایک نوجوان افسر اس کی طرف اشتیاق سے بڑھتا چلا آرہا تھا۔ آگے جھک کر اس نے وکرم کے پیر اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے، ہونٹوں پر کچھ ان کہے لفظ اور آنکھوں میں آنسو صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وکرم نے آنے والے کو پہچانا، اس کے سینے پر لگے میڈل ربن پر اس کی نظر پڑی اور اس نے جذباتی ہو کر بے انتہا خوشی اور اطمینان کی سانس لی۔ اس کے سر پر دعا اور حوصلہ افزائی کا ہاتھ رکھا لیکن وکرم اپنے آنسو ٹپکنے سے نہ روک سکا۔

روز ازل سے ہی سامنت اور شیخ، راجا اور دیش یہاں تک کہ ڈاکو اور دہشت پسند تنظیم یہ سب جنگ اور حملے کے لیے سپاہی اکٹھا کرتے رہے ہیں۔ کبھی قوم یا مذہب کے نام پر حوصلہ افزائی کر کے، کبھی جبراً بھرتی سے، جیسے آج کی مغربی ممالک میں ''ضروری قومی خدمات'' کے نام پر، کبھی بہلا پھسلا کر، کبھی بزدلی کے لیے دھکارنے پر، کبھی دھن دولت، جنت اور حور کا لالچ دینے پر اور غریب ملکوں میں صرف نوکری کا لالچ دینے پر۔ انھی میں سے اکثر بہادر لڑاکے نکلتے ہیں، ان کی روایتیں ہر ملک ہر قوم کی وراثت ہوتی ہیں لیکن ہر بہادر اپنے کو جدید کرن یا ارجن سمجھنے والا ہر جنگجو کہیں نہ کہیں اپنے اندر جسمانی نقصان اور موت کا خوف ضرور چھپائے رہتا ہے۔ جیسے جیسے جنگ قریب آتی ہے، ایک بہادر سپاہی بننے کی امید کے ساتھ شہید ہو جانے کی فکر بھی ہمیشہ بنی رہتی ہے۔ زیادہ تر سپاہی متوقع بہادری اور بزدلی کے دائرے میں رہ کر اپنا فرض نبھاتے ہیں۔ کچھ ضرورت سے زیادہ نڈر اور بہادر ثابت ہوتے ہیں تو کچھ ڈرپوک اور بزدل بھی۔ لیکن جب کبھی ایک خوفزدہ اور پیچھے رہنے والا سپاہی کسی مخصوص حالت میں ایک دم سے بے خوفی اور بہادری کی طرف بڑھ جاتا ہے تو لڑائی کا رخ ہی بدل دیتا ہے۔

تین دسمبر 1971، شام کے جھٹپٹے سے کچھ پہلے پاکستانی ایئرفورس نے بھارت کے اتری اور پچھمی حصوں میں سات ملٹری ہوائی اڈوں پر بمباری کی۔ زبردست بمباری کہیں نہیں ہوئی۔ یہ صرف جنگ کا اعلان تھا، لڑائی شروع کرنے کا دعوت نامہ۔ اس کا احساس کچھ دنوں سے سبھی کو تھا۔ اتنا کہ دونوں طرف جنگ کی ابتدائی چالوں کا مطالعہ بہتر طریقے سے ہو چکا تھا، سارے امکانات پر بحث ومباحثہ اور غور وفکر ہو چکا تھا۔ حملے کے لیے ٹھکانوں کا چناؤ اور ان کے نقشے انتہائی رازدار الماریوں میں بند تھے۔ اب ان کو نکالنے اور ان پر عمل درآمد کرنے کا وقت آگیا تھا۔

پنجاب کے آدم پور ہوائی اڈے پر پاکستانی بموں کے پھٹتے ہی بیرکوں اور میس ہالوں میں ہلچل شروع ہوگئی۔ افسر، جے سی او، ایرمین اپنے اپنے مقام عمل کی طرف ہر طرح کی سواریوں پر تیزی سے دوڑ کر پہنچنے لگے۔ میکینکوں نے جہازوں کو چیک کرنا شروع کر دیا۔ پائلٹس آپریشن روم میں اکٹھا ہو گئے۔ سب کو حملے کے لیے الگ الگ ٹولیوں میں نامزد کر دیا گیا۔ نقشوں پر ایک اور نگاہ ڈال لینے کے حکم کے ساتھ ہی صبح پو پھٹنے کا وقت حملے کے لیے طے کیا گیا۔ آخر میں اس ہدایت کے ساتھ کہ کھانا کھاؤ جلدی سو جاؤ اور سویرے زوردار حملہ بول دو، اس کے ساتھ سب کو وہاں سے روانہ کر دیا گیا۔ رات نو بجے وکرم اپنے بستر پر کمبلوں میں لیٹا ہوا تھا۔ کچھ وقت پہلے ایک بھلے ٹیلی فون آپریٹر کی مہربانی سے دور شہر میں اپنی بیوی سے بات کر چکا تھا۔ وہ دور شہر، کائنات کا ایک دیگر حصہ، امید اور خوف سے بھری ایک الگ دنیا......

ریڈیو پر ابھی ابھی پاکستانی بمباری کی خبر آئی ہے، وہ بولیں، اب کیا ہوگا؟

''بس اب شروعات ہے......'' وکرم نے کہا۔

وکرم کا دھیان اچانک پچھلے تین ہفتوں کے واقعات پر گیا۔ دیر شام کو آفس سے آنے کے بعد وہ اور اس کی بیوی اپنے گھر کے باہر سڑک پر چہل قدمی کیا کرتے تھے۔ دونوں کو اس موقع کا انتظار رہا کرتا تھا کیوں کہ تنہائی اور پرسکون ماحول میں اہل خاندان بچوں اور گھر گرہستی کے بارے میں اپنے خیال، اپنی خواہشات اور آرزوئیں وہ زیادہ تر اسی وقت ایک دوسرے پر ظاہر

''جلتے پاس آتے دور'' سے ماخوذ، مصنف: دھریندر سنگھ جفا، صفحات۔270، قیمت: -/145

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

کرتے تھے، بحث کرتے تھے اور بے حد محبت کرنے والے زوجین کی طرح فیصلہ کرتے تھے۔ جب وکرم کو لگنے لگا کہ ہندو پاک جنگ ٹالی نہیں جاسکتی بلکہ لڑائی ہوکر رہے گی، تو یہ خیالات بھی اس نے اپنی بیوی بیلا کے سامنے رکھے۔ باتیں جب آگے بڑھیں تو بیلا کو شک ہونے لگا کہ ''یہ'' لڑائی میں کود پڑنے کا خواب تو نہیں دیکھ رہے ہیں؟

''وکی! تم تو ایسی اہم جگہ پر اس وقت تعینات ہو۔ تمھیں تو ہر لمحے کی اطلاع رہے گی،'' بیلا نے ایک دن گفتگو شروع کی۔

''ہاں، مگر یہی تو بات ہے۔ ایسے وقت میں میں یہاں پھنسا ہوا ہوں،'' وکرم نے دکھی من سے کہا۔

بیلا نے پوچھا ''کیا مطلب؟''

''دیکھو میرے سارے ساتھی ملند، موہن، جگّو، جیو اور مینڈی وغیرہ کس طرح لڑائی کے بارے میں باتیں کیا کرتے تھے۔ کیسے سب کو آمادہ کیا کرتے تھے۔ ٹریننگ اور مشق میں ایک دوسرے کا پسینہ نکال لیتے تھے۔ تم تو سب کچھ جانتی ہی ہو۔''

''ہاں ان کو جنگ کے لیے تیار کرنے میں تم نے کوئی کور کسر باقی نہیں رکھی۔ اب وہ اتنے ماہر فائٹر پائلٹ ہیں کہ جنگ میں ضرور بہتر جھے داری درج کرائیں گے،'' بیلا نے دوسروں پر ہی زور دے کر کہا۔

''وہ تو ہے،'' وکرم بولا۔ ''کچھ تو ضرور بہادری دکھائیں گے مگر کچھ شہید بھی ہوں گے۔''

بیلا کچھ نہ بولی۔ کچھ بول ہی نہیں سکی۔ وکرم نے ایسے امکانات سامنے رکھ دیے جسے وہ قبول نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن رد بھی نہیں کرسکتی تھی کیونکہ ان امکانات میں اس کا محبوب، سولہ برس سے اس کا مدعا، جنم جنم سے بندھا ہوا اس کا ساتھی، آج اس کی بانہوں میں ہنستا، ہنساتا، شاداب و شگفتہ اس کا شوہر وکرم بھی شامل تھا۔

اگلی شام وکرم نے پھر وہی رٹ لگائی، ''بیلا! دیکھو میرے ساتھ کے لوگ اپنے آپ کو لڑائی میں جھونک رہے ہوں گے، جان دے رہے ہوں گے اور میں یہاں آرام سے دفتر میں بیٹھا رہوں گا۔ یہ بات مجھے اندر ہی اندر کھائے جارہی ہے۔''

اپنے فرض اور اپنی خوشی کے بیچ لٹکا ہوا وکرم، اپنے شوہر کی محبت اور اس کی فرض ادائیگی میں رکاوٹ پیدا کرنے کے خوف کے بیچ لٹکی بیلا۔ لڑاکوں اور ان کی بیویوں کو الجھانے والے یہ سوال، قربانی یا خود کی حفاظت، وطن پروری یا خود سلامتی جیسے سوالیہ نشان روز ازل سے ہی انسانوں کے سامنے تھے۔ جودھابائی اکبر اعظم کو تلک لگا کر میدان جنگ کے لیے الوداع کہتی تھیں، تو بہت سی رانیاں اور مہارانیاں ایسی بھی ہوئی ہیں جنھیں شوہروں کو رن میں جاتے دیکھ غش آجایا کرتا تھا۔

جنگ میں حصہ لینے کی وکرم کی شدید تمنا، اسے محفوظ اور زندہ دیکھنے کی بیلا کی آرزو..... اسی جدوجہد میں، اسی جرح اور بحث میں کئی شامیں گزر گئیں۔ آخر ایک شام ایسا بھی وقت آیا جب بیلا بہت ہی پرسکون، اپنے خیالوں میں ڈوبی ہوئی کافی دیر تک وکرم کے ساتھ ٹہلتی رہی۔ اس کی خاموشی اور گفتگو میں صرف ہوں، ہاں کے مستقل استعمال سے وکرم پریشان ہوا تھا۔

''بیلا! کچھ بولتیں کیوں نہیں؟'' وکرم سے رہا نہ گیا اور اس نے پوچھ ہی لیا: ''کیا سوچ رہی ہو؟'' وکرم نے اس کی کمر پر ہاتھ رکھ کر بڑے پیار سے دباتے ہوئے کہا: ''بیلا، بتاؤ آخر میں کیا کروں؟''

بیلا چپ رہی۔ اس نے دھیرے سے وکرم کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ قدم قدم جہاں تھے وہیں رک گئے۔ اس نے وکرم کی طرف مڑ کر اپنا سر اوپر اٹھایا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، ''وکرم تم جاؤ، اپنی لڑائی لڑو، جو تمھیں ٹھیک لگ رہا ہے وہ کرو۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ، اپنے فرض کے لیے جاؤ، مجھ سے نہ پوچھو۔ میری فکر نہ کرو، جاؤ، وکرم جاؤ۔''

مبہوت۔ بیلا کے ان جملوں سے حیرت زدہ وکرم، کچھ سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ غصے اور جھلاہٹ میں کہہ رہی ہے یا اس نے حقائق کو قبول کرلیا ہے۔

''تم ناراض ہو؟'' اس نے پوچھا۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بیلا نے کہا، ''نہیں، بالکل نہیں، میں ناراض نہیں ہوں، بلکہ بہت غور و فکر کے بعد کہہ رہی ہوں۔ دیکھو وکی، میں سمجھ رہی ہوں تم کو اس جنگ میں جانا ہی ہے۔''

''تمھیں میرے مرنے کا ڈر نہیں بیلا؟'' وکرم نے اس کے ارادوں کی پختگی کا پھر امتحان لیا۔

بیلا نے بغیر کسی تکلف کے کہا، ''نہیں وکی، مجھے اب کوئی ڈر نہیں، کوئی فکر نہیں ہے کیونکہ مجھے تو دونوں طرح سے تمھیں کھونا ہے۔ اگر تم جنگ میں قربان ہوگئے تب بھی تم میرے لیے کھو ہی جاؤ گے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اور اگر تمھیں جنگ میں جانے سے روک لیتی ہوں تب بھی میں تمھیں کھو دوں گی۔ جس وکی کو میں جانتی سمجھتی ہوں، جو میری رگ رگ میں بسا ہوا ہے، جس کے کردار میں میں کسی بھی طرح کی تبدیلی برداشت نہیں کرسکتی۔ میں جانتی ہوں کہ مصیبت کے وقت اپنے فرائض کی ادائیگی نہ کرپانے سے تم وکی رہو گے ہی نہیں۔ اندر سے، من سے، روح سے یا جسم سے کہیں سے بھی تم میرے، کہیں سے تم میرے وکی نہیں رہ جاؤ گے۔''

بیلا کی پلکوں پر آنسو لرز رہے تھے۔ ایک حساس اور دلدوز آواز میں اس نے کہا، "میرا تو دونوں حالات میں نقصان ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ کم سے کم تم ہی مطمئن رہو۔ تمھاری خودداری، تمھاری فرض شناسی تو برقرار رہے۔ سرحد کی جنگ سے کہیں زیادہ اہم وہ جنگ ہے جو تم مستقل اپنے آپ لڑ رہے ہو اور یہ امتحان بھی تم نے اپنے لیے خود مقرر کیا ہے۔ اس لیے وکی اب تو تمھیں جانا ہی ہے۔"

"کل.....کل ہی صبح تم جاؤ گے؟" بیلا نے سسکتے ہوئے پوچھا۔

یہ وقت بڑا نازک ہے۔ وکرم اس موضوع کو بڑھانے سے ڈر رہا تھا۔

"دیکھو! میں کچھ دنوں 'بنی' کی 'میتھس' نہیں دیکھ پاؤں گا، باقی سبجیکٹس تم دیکھ لینا" وکرم نے بات بدل دی، اور بیلا کو لڑائی کے بارے میں بات کرنے کا موقع نہیں دیا۔ بیلا بھی سمجھ رہی تھی کہ جذبات کو الگ رکھنا ہی ٹھیک ہوگا، حالانکہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ وکرم کی آواز پھر کبھی بھی نہ سن پائے۔

آخر میں اس نے ایک بناوٹی جوش کے ساتھ اسے الوداع کہا، آل دی بیسٹ وکی، لک آفٹر یور سیلف۔

اور اب بستر میں لیٹے ہوئے کروٹیں بدلنے کا وقت۔ نیند غائب تھی، دماغ جانے کہاں کہاں گشت کر رہا تھا۔ مگر وکرم کو تعجب تھا کہ اس وقت گھر خاندان، اعزا و اقربا سے متعلق خیالات ذہن میں کم ہی آ رہے تھے۔ اسے تو رہ رہ کر دشمن کے جہاز، ٹینک، توپیں اور جگہ جگہ ہوتے ہوئے دھماکے ہی دکھائی دے رہے تھے اور ان تمام خیالوں اور تصویروں کے بیچ ایک عجیب سا احساس، ایک برائی کا احساس ذہن کو مضطرب کیے ہوئے تھا۔ یہ کھلبلی اور یہ گھبراہٹ آخر دروازے پر ہوئی دستک سے ٹوٹ گئی۔

"وکرم سر!....." ایک ہلکی سی آواز آئی۔ وکرم ڈینی کی آواز پہچان کر بستر سے باہر نکلا۔ اس نے سوچا شاید ڈینی کوئی خاص پیغام لے کر آیا ہے۔

"کیا بات ہے ڈینی؟" وکرم نے دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔ وہ نوجوان افسر باہر ٹھنڈ میں کھڑا ہوا تھا۔ اس نے جب کوئی جواب نہیں دیا تو وکرم نے قدرے جھلاہٹ کے ساتھ کہا، "ڈینی! بات کیا ہے؟ بتاتے کیوں نہیں؟"

"سر!..... مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے،" ڈینی آخر بول پڑا۔ "لیکن اگر آپ سو رہے ہوں تو......"

"اب تو تم نے جگا ہی دیا ہے،" یکا یک وکرم نے اپنے آپ کو آگے کچھ کہنے سے روک لیا۔ ڈینی کی آواز میں کچھ پریشانیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں اس لیے وکرم نے بڑی نرمی سے کہا: "اچھا ڈینی آؤ اندر آجاؤ۔"

وکرم تکیوں کی ٹیک کے سہارے بستر پر بیٹھ گیا اور ڈینی کو بھی اپنے پاس ہی بیٹھا کر کمبل کا ایک حصہ اس کے پیروں کی طرف بڑھا دیا۔ وکرم نے مسکراتے ہوئے اپنی بھنویں اونچی کیں جیسے دوبارہ اطمینان دلاتے ہوئے اسے اپنی بات کہنے کی دعوت دے رہا ہو۔

ڈینی نگاہ نیچی کیے ہوئے بولا، "سر مجھے..... مجھے سر بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

بائیس برس کا یہ فائٹر پائلٹ، یہ جوانی اور یہ صحت، ایسے میں تو حوصلے اور اتاولے پن کی توقع ہوتی ہے پر یہ کیا؟ ایک ماہر پائلٹ، اچھا افسر، جس سے آئندہ کے لیے بڑی امیدیں کی جاسکتی تھیں۔ پر اب اسے کیا ہوگیا؟

فوج میں خوف کو بزدلی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ردعمل کے طور پر کسی بزدل کو بڑی ہی حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ کافی حد تک یہ ٹھیک بھی ہے کیوں کہ ایسا برتاؤ کسی طرح کی ہچک رکھنے والوں کو کم سے کم ایک فرضی بہادر کا چہرہ ہی سامنے رکھنے پر مجبور کرتا ہے اور امید کی جاتی ہے کہ اداکاری کے طور پر ہی سہی کچھ نہ کچھ دیر تو موقع پر ڈٹا ہی رہے گا، لیکن یہ دوا ہر مرض میں فائدہ نہیں پہنچاتی اور نہ ہر مریض پر اس کا مثبت اثر ہوتا ہے۔ خاص طور سے جب ایک طرف ڈینی جیسی سوجھ بوجھ کا افسر ہو اور دوسری طرف سر پر گھمسان لڑائی۔ ایسے حساس اور نازک حالات میں بھی وہ ڈینی کو کل صبح حملے پر جانے والی ٹولیوں سے کیا بلکہ پوری لڑائی تک اسے مورچوں سے الگ رکھ سکتا تھا لیکن یہ ایک اکسپرٹ پائلٹ اور اچھے افسر کو کھو دینے جیسا ہوگا۔ وکرم اس ٹیم کا لیڈر تھا۔ اس کا کام تھا، سب کو ساتھ لے کر چلنا۔ وہ چاہے اچھے ہوں یا برے، بہادر ہوں یا کمزور۔ اصلی چنوتی تو کمزور کو سنبھالنے کی ہوتی ہے۔ تو کیا وہ ڈینی کو سنبھلنے میں مدد دے سکتا تھا۔ کم سے کم اس کے ڈر کو وہیں روک کر اسے اتنا حوصلہ تو دے ہی سکتا تھا کہ وہ اوروں کے پیچھے لگ کر تھوڑا بہت فرض نبھا لے۔ بھلے ہی کسی محاذ پر اکیلے نہ آگے بڑھے لیکن دوسروں کے ساتھ جا کر بم تو گرا ہی آئے۔

ہوشیار، وکرم نے خود کو سمجھایا، کوئی بھی ایک غلط لفظ کہنا یا اشارتاً بھی اسے کمتر ہونے کا احساس کرانا اس ہونہار نوجوان کو ذہنی طور سے برباد کردے گا۔ وہ زندگی میں کبھی بھی کمتری کے اس احساس سے ابھر نہیں پائے گا۔ اس لیے صرف سچ، یہاں تک کہ جینے مرنے کی تلخ سچائی، دل میں بسی امید اور ڈر کے دو پہلو، حوصلہ اور بزدلی کے بیچ کی پتلی سی لکیر، اور ان سب کے اوپر، سب پر حاوی، انسان کی فرض شناسی اپنے لیے، اپنی فوج کے لیے، اپنے ملک کے لیے، یہی سب سمجھنا تھا، سمجھانا تھا۔ خوف سے اوپر اٹھ کر ہاتھ بٹانا تھا۔ اس لیے بڑی آسانی اور نرم روی سے وکرم نے دھیرے سے کہا، "سچ پوچھو تو ڈینی ڈر تو مجھے بھی بہت لگ رہا ہے۔"

"سر؟" ڈینی چونک کر بولا۔ وہ وکرم کو گھور کر دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس کے

کان سننے میں کچھ غلطی کر گئے ہیں۔ اس کا یہ کمانڈر.......... اور ڈر؟ یہ آدمی جو تیرہ تاریخ والے جمعہ کو ضرور اڑان بھرتا تھا، جو دیوار پر لگی سیڑھیوں کے نیچے سے ضرور گزرتا تھا، صرف اندھی عقیدت اور خوف کو سب کے سامنے چنوتی دینے کے لیے۔ سب کو حوصلہ مند تحریک دینے کے لیے، پائلٹوں کے دل سے انہونی کی علامتوں اور اس کی اہمیت کو ختم کرنے کے لیے، اور ایسے انسان کو بھی لڑائی میں جانے کا ڈر؟

''ہاں ڈیبی، بالکل سچ،'' وکرم نے کہا۔ ''اور کون ہے؟— جو جنگ میں جانے سے پہلے خوفزدہ نہیں ہوتا۔ اور اگر کوئی ہے تو جھوٹا ہے، یا گدھا ہے جس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔''

''سر آپ مجھ سے ناامید تو نہیں ہیں؟'' ڈیبی نے گھبراہٹ میں پوچھا۔

''اگر تم کہتے کہ لڑائی پر جانے کا تمھیں کوئی ڈر ور نہیں ہے یا تمھیں کسی طرح کی فکر نہیں ہے، تو میں ضرور سکپکا تا، اور تمھارے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوتا۔ دیکھو جلد بازی میں اندھے ہوئے لوگ ہی خوف سے انکار کرتے ہیں، اپنی اکڑی میں خود کو لافانی اور وقت کو فتح کر لینے والا سمجھنے لگتے ہیں۔ واقعی ایسے بہت لوگوں کو میں نے کریش کی آگ اور دھویں میں اپنے انجام کو پہنچتے ہوئے دیکھا ہے۔ نہیں ڈیبی تم بدحوصلہ اور ڈینگ مارنے والے نہیں ہو۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایک عام آدمی کی طرح تمھیں بھی کچھ خوف یا کسی انہونی کا اندیشہ پریشان کر رہا ہے۔ آج کی رات یہاں ہر ایک انسان کچھ ایسے ہی تخیلات سے گزر رہا ہوگا۔''

''پھر مجھے کیا کرنا چاہیے سر؟'' ڈیبی نے کچھ اور بڑھے ہوئے حوصلے کے ساتھ کہا۔

''کیا کرنا چاہیے؟ کیا کر سکتے ہو؟'' وکرم کو لگا کہ شاید اسے کامیابی مل رہی ہے۔ ''دیکھو ڈیبی، ایسا ہے، جب جنگ قریب آنے لگتی ہے، جیسا انیس سو باسٹھ میں، پھر پاکستان کے خلاف انیس سو پینسٹھ میں اور اب انیس سو اکہتر میں، تو ہمارے تمھارے جیسے فوجیوں کا رات میں تارے گنتے رہنا فطری ہے۔ میاں والی اور سرگودھا کے ہوائی اڈے اور وہاں کھڑے سبر اور ایف -104 جہاز انھیں رات بھر دکھائی دیں گے۔ تم امرتسر یا پیشاور کے اوپر فضا میں دشمن کے جہازوں سے بھڑے ہوئے ہو یا ڈایو Dive میں ہو اور پاکستانی ٹینک تمھاری توپوں کے نشانے پر ہیں۔ تم گولیاں چلاتے ہو، دشمن کو تہس نہس کرتے ہو اور ایک ہیرو کی طرح واپس آتے ہو۔ کبھی دشمن کی گولیاں تمھارے جہاز کو بھیدتی ہیں، تم پیراشوٹ سے کودتے ہو، زمین پر دشمن سے بچ کر چھپتے چھپاتے واپس اپنے وطن لوٹ آتے ہو۔ ایک دم ہیرو تو نہیں پھر بھی ایک باحوصلہ، ہار نہ ماننے والوں کی قطار میں۔'' تھوڑا رکنے کے بعد وکرم آگے بڑھا۔ ''تو ڈیبی! اس وقت کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اپنے دل میں سو چو رسال پور اور چھمبرا کے ہوائی اڈوں اور وہاں قطار سے کھڑے ''مگ 19'' جہازوں کے بارے میں اور کل صبح وہاں پہنچ کر ان سب کو اڑا دو، بس یہی سوچنا ہے اور یہی کرنا ہے۔''

''سر! وہاں میزائلیں بھی تو ہوں گی؟'' وکرم کے سمجھ میں اب آیا کہ ڈیبی کا خوف انھیں میزائلوں پر مرکوز تھا۔

''ہونی تو چاہیے۔'' وکرم نے بے توجہی سے کہا، ''مگر تم تو پیڑوں کی اونچائی پر فلائنگ کرو گے، تمھارے اوپر یہ میزائلیں لاک نہیں ہو سکیں گی اور کچھ ہوتا بھی ہے تو کیا؟ ہمارے جہازوں میں اتنی اچھی اجکشن سیٹ ہے، بٹن دبایا نہیں کہ پیراشوٹ کے سہارے صحیح سلامت جہاز سے نیچے۔''

اس حساب سے پائلٹ کو خطرہ ہی کیا ہے؟ سب کچھ محفوظ، حفاظت کا ہر انتظام پختہ۔ مگر ڈیبی اس وقت مسحور تھا اور وکرم کی زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو سچ مان رہا تھا۔ آخر میں یہ مسئلہ تب حل ہوا جب ڈیبی نے کہا، ''سر! آپ مجھے کل اپنا نمبر دو بنا کر چل سکتے ہیں؟''

''ضرور — اگر تمھاری یہی خواہش ہے'' وکرم نے ڈیبی کی بات مانتے ہوئے کہا۔ ''کل صبح میں تمھاری جگہ بدل دوں گا۔ ویسے بھی تم دو چار بار میرے ہی ساتھ چلو۔ مگر میرا خیال رکھنا ہوگا، دشمن کے جہازوں کو میرے نزدیک پھٹکنے مت دینا۔''

صبح ہوتے ہی ڈیبی نے اپنی زندگی کی پہلی جنگ کے پہلے حملے کے لیے اڑان بھری۔ فلائنگ بالکل متوازن، ہر قلابازی جیسے سیدھے کتاب سے نکالی گئی ہو۔ پھر بھی وکرم حوصلہ بڑھانے کے لیے ریڈیو پر حوصلہ افزائی کے دو چار جملے ضرور بول دیتا تھا۔ حملے بہت ہی کامیاب رہے۔ ایک دو نہیں بلکہ وکرم اور ڈیبی نے اس روز پاکستان پر تین بار حملے کیے۔ وکرم ہر بار لوٹنے پر حملوں کے بارے میں ہی باتیں کیا کرتا تھا۔ پچھلی رات کی گفتگو کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں۔ دوسرے دن کے حملوں کے بعد وکرم نے سوچا کہ اب ڈیبی دھیرے دھیرے خود کفالت کی طرف ڈھکیلنا ہی ٹھیک رہے گا، اس لیے اگلے دن اس نے ڈیبی کو کسی بہانے سے دوسرے سینئر پائلٹ کے ساتھ بھیج دیا اور اب اس کے لیڈر تھے موہن۔ خود اعتمادی اور مہارت سے بھرے ہوئے، دوسروں کی خامیوں کے بجائے اپنی اچھائیوں پر نگاہ رکھنے والے۔ موہن کی رہنمائی میں ڈیبی اور بے خوف و نڈر ہوتا گیا۔ اس کی خود اعتمادی نقطۂ عروج کو پہنچ چکی تھی لیکن ڈیبی کو اگلے ہی روز زوردار دھکا لگا۔ وکرم کا جہاز پاکستان میں مار گرایا گیا اور اسے ''جنگ میں لاپتہ'' مشتہر کر دیا گیا۔ اتنا ہی نہیں اس کے دوسرے دن دیکھتے دیکھتے موہن کا جہاز دشمن کی توپوں سے زخمی ہو کر فضا ہی میں بم کی طرح

پھٹ گیا۔ جن دو لوگوں نے اسے حوصلہ ہی نہیں بخشا بلکہ اس کی قوت ارادی کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور اپنی حفاظت کی پروانہ کرتے ہوئے اس جیسے اناڑی کو جنگ میں اپنے ساتھ بھی رکھا، آج اس سے بہت دور ہیں۔

رات بھر ڈینی سوچتا رہا۔ وکرم اور موہن نے اسے خوف اور ملامت سے ابھارا تھا۔ اسے میدانِ جنگ میں متحرک ہونے کے قابل بنایا تھا۔ ان کی احسان مندی میں اب وہ وہی کرے گا جس کی ان دونوں نے اس سے امید کی ہوگی۔ اب وہ ایک بہادر فائٹر پائلٹ ہو کر دکھائے گا۔

اس وقت ہندوستانی فوج پاکستان کے شکر گڑھ علاقے میں کافی اندر تک گھس چکی تھی۔ ایک ایک انچ زمین کے لیے گھمسان لڑائی چھڑی ہوئی تھی۔ پاکستانی ٹینک ہندوستانی فوج کو پیچھے کھدیڑنے کے لیے متحرک ہو اٹھے تھے۔ ایک مورچے پر وہ کامیاب ہوتے دکھائی بھی دیے۔ ہوا یوں کہ ان کے ٹینک بڑی تیزی سے بڑھتے ہوئے ہمارے جوانوں پر زبردست گولہ باری کر رہے تھے۔ ہماری فوج نے انھیں روکنے کے لیے ایئر فورس کی مدد مانگی۔ فوراً جہاز بھیجے بھی گئے۔ جہازوں کو آتا دیکھ ٹینک رک کر ایسا چھپ گئے کہ ہندوستانی فوج کے پائلٹ انھیں دیکھ ہی نہیں پائے لیکن ہمارے جہازوں کے لوٹتے ہی ٹینک پھر میدان میں آگئے۔ ہمارے جوانوں کی چیخ پکار پھر آدم پور کے بیس کمانڈر تک پہنچی، وہ بھی جھلائے، ''دوبار جہاز بھیج چکا ہوں، چار جہاز یعنی چار جوڑی آنکھیں، مگر یہ ہیں کہ ان کو ٹینک نظر ہی نہیں آتے۔ فوج سے کیا کہوں کہ ہمارے پائلٹس کے سروں میں صرف دو عدد گنڈھے ہیں ان میں آنکھیں نہیں؟''

پاس کھڑا ڈینی سب کچھ سن چکا تھا۔ بغیر زیادہ سوچے وہ ہمت کر کے بولا، ''سر! بھی وقت ہے۔ مجھے ایک بار کوشش کر لینے دیجیے۔ سر اس بار مجھے جانے دیجیے۔'' کمانڈر نے اس نوجوان پائلٹ کی طرف دیکھا کچھ سوچا، پھر حکم دیا کہ ڈینی اپنی رہنمائی میں دو جہاز لے کر جائے گا۔ ڈینی نے پہلے محاذ پر گئے پائلٹس سے جلدی جلدی اس علاقے کی جانکاری پھر تزت اپنے ایک ساتھی کو ساتھ لے کر اڑان بھری اور تھوڑی ہی دیر میں مورچے پر پہنچ گیا۔

ہم لوگ مصیبت میں ہیں گولڈ ون۔ بھگوان کے لیے چوکنا مت، نیچے سے ڈینی کو اس کے ''کال سائن'' سے مخاطب کرتے ہوئے ایئر کنٹرولر کی آواز ریڈیو پر سنائی دی۔

''او کے'' ڈینی نے جواب دیا: ''ٹینکوں کی نشاندہی کرنے کی کوشش کرو۔''

''گولڈ ون! تم ہمارے اوپر سے ابھی گزرے ہو۔ سیدھے دیکھو، داہنی طرف، ندی کے پورب میں، وہیں مکانات کا ایک جھنڈ ہے''

''دیکھ لیا۔ کچھ آگے نکل آیا ہوں۔ واپس مڑ رہا ہوں،'' ڈینی بولا۔

''انھی گھروں کے دکن میں تقریباً ہزار گز کی دوری پر ایک بہت ہی گھنا سا باغ ہے، دکھائی دیا؟ ٹینک اسی باغ کے اندر چھپے ہیں۔ تقریباً آٹھ دس۔''

ڈینی نے باغ پر نظر ڈالی۔ سب کچھ پرسکون، کہیں کوئی حرکت تک نہیں۔ پورا علاقہ پیڑوں سے پوری طرح ڈھکا ہوا۔ کہیں کہیں زمین دکھائی بھی دیتی تھی تو خالی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جہاز کا پٹرول بھی کم ہوتا جا رہا تھا۔ ڈینی نے سوچا کیا اسے بھی ناامید ہی واپس جانا پڑے گا؟ اور تو اور زمینی فوج کے ان بے چارے جوانوں کا کیا ہوگا؟

کبھی کبھی کسی چھوٹی سی بات یا معمولی سی غلطی سے لڑائی کا رخ کس طرح پلٹتا ہے اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ نیچے کی طرف مستقل آنکھیں گڑائے ہوئے ڈینی نے ایک دم سے آگے بائیں طرف باغ میں کھلی زمین پر کچھ ہلتا ہوا دیکھا۔ ارے دو آدمی وہ بھی فوجی وردی میں۔ بہت دھیان سے دیکھتا ہوا جب وہ ان کے اوپر سے گزرا تو دیکھا کہ ان فوجیوں کے قریب ہی ایک الگ سی پرچھائیں، بڑا بکسہ نما ایک ہیولی۔ ارے مل گیا ٹینک مل گیا۔ فوراً ڈینی نے اس جگہ کا نشانہ لیا اور ایک ساتھ آٹھ راکٹ چلائے یہ سوچ کر کہ ایک تو صحیح ٹھکانے پر پہنچے گا۔

''گولڈ ون! ویل ڈن'' نیچے سے ریڈیو پر آواز آئی۔ ''وہ دیکھو ٹینک میں سے دھواں نکل رہا ہے۔''

ڈینی نے آس پاس کے پیڑوں کے تنے پر ہی نشانہ لگانے کا فیصلہ کیا اور اپنے ساتھی پائلٹ سے بھی ایسا ہی کرنے کو کہا۔ ان کے اگلے دو حملوں میں ایک اور ٹینک سے دھواں نکلنا شروع ہو گیا۔ دشمن کو یقین ہو گیا کہ اس کا یہ ٹھکانہ ہندوستانی آنکھوں سے اب چھپا نہیں رہ گیا، اس لیے باقی بچے ٹینکوں سے جوابی فائرنگ شروع ہو گئی۔ پٹرول کافی کم ہو چکا تھا، ڈینی کو چاہیے تھا کہ وہ یہیں مورچہ چھوڑ دے، لیکن جوش میں ایک اور.....

نیچے سے تڑاتڑ گولیوں کی بوچھار ہو رہی تھی۔ ڈینی ڈائیو سے جہاز نکال رہا تھا، مگر ایلی ویٹر کے ٹھیک سے کام نہ کرپانے کی وجہ سے جہاز بڑی ہی مشکل کے ساتھ اوپر اٹھا، پھر بھی ایک پیڑ کی اوپری ٹہنیوں سے رگڑ کھاتا ہوا کسی طرح زمین پر کریش ہونے سے بچا۔

''لگتا ہے ''ایلی ویٹر'' پھنسا ہوا ہے اس لیے ٹھیک سے کام نہیں کر رہا ہے،'' ڈینی نے اپنے ساتھی سے کہا۔ دراصل ''ایلی ویٹر'' جہاز کا وہ حصہ ہوتا ہے جو جہاز کو اوپر یا نیچے کی طرف لے جاتا ہے لیکن جب گولڈ ون نے اپنا جہاز ڈینی کے جہاز سے قریب لا کر دیکھا تو ڈینی کے جہاز کے ''ایلی ویٹر'' کا ایک بڑا حصہ غائب تھا اور اس کے آس پاس بڑے بڑے سوراخ نظر آ رہے تھے۔ ظاہر تھا

کہ یہ نقصان زمینی توپوں کی فائرنگ سے ہی ہوا تھا۔

جہاز بہت ہی آہستہ آہستہ کچھ اوپر اٹھا اور ڈینی نے اسے گھر کی طرف موڑا۔ گولڈٹو، ڈینی کے جہاز پر احتیاط سے نظر رکھے ہوئے تھا، پتہ نہیں کب ہوا کا دباؤ بڑھ جائے اور جہاز کنٹرول سے باہر ہو جائے۔ اس کا دل بھگوان سے لگاتار یہی پرارتھنا کر رہا تھا کہ کسی بھی طرح ڈینی بامسب لائن پار کر لے تاکہ اگر اس کے بعد اسے جہاز چھوڑنا بھی پڑے تو وہ کم سے کم اپنے ہی علاقے میں نیچے آئے گا۔

اپنی فضا میں پہنچ کر ڈینی نے جہاز کو اوپر لے جانا شروع کیا۔ جہاز ہچکولے کھا کھا کر ادھر ادھر مڑ رہا تھا، ایسی حالت میں اسے زمین پر اتارنا ٹیڑھی کھیر تھی لیکن ڈینی نے سوچا کہ وہ کوشش تو ضرور کرے گا۔ دراصل کوئی بھی ذمے دار پائلٹ جہاز کی قیمت سمجھتے ہوئے اسے چھوڑنا نہیں چاہتا بلکہ اسے بحفاظت آخری پلوں تک واپس لانے کی جدوجہد جاری رکھتا ہے۔

گولڈٹو، نے آدم پور ہوائی اڈے کے کنٹرول ٹاور کو اطلاع دی کہ ڈینی کا جہاز بری طرح نقصان زدہ ہو چکا ہے اور لینڈنگ کے وقت اسے مشکل آسکتی ہے، اس لیے ایمرجنسی ڈرل شروع کی جائے۔ کنٹرولر نقصان زدہ جہازوں کو لینڈ کرانے کا عادی ہو چکا تھا اس لیے اس نے فوراً دوسرے جہازوں کو الگ الگ اونچائی پر چکر لگانے کا حکم دیا اور پورا ہوائی اڈہ ڈینی کے لیے خالی کروالیا۔

دور سے ہوائی پٹی یعنی ''رن وے'' دیکھ کر اس نے دھیرے دھیرے جہاز کی سمت اس سے ملائی، پھر نیچے آنا شروع کیا۔ کنٹرول ٹاور میں دوربینوں کی مدد سے لوگ ڈینی کے جہاز کو آسمان میں دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جلدی ہی نیچے سے آواز آئی، ''گولڈ ون'' ہم آپ کو متواتر دیکھ رہے ہیں آپ بالکل صحیح سمت میں رن وے کی طرف آ رہے ہیں۔

حالانکہ اس طرح کی باتوں کی ضرورت تو نہیں ہوتی لیکن اس سے پائلٹ کی ہمت بندھی رہتی ہے اور اسے ہر لمحہ یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کے ساتھی مصیبت کی اس گھڑی میں اس کی مدد کے لیے کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور اب ڈینی زمین کے بہت قریب آ چکا تھا۔ نیچے آنے کے ساتھ ساتھ اس نے جہاز کو ہموار کرنا شروع کیا۔ زمین پر سب نے دیکھا کہ جہاز کا اگلا حصہ کس طرح جھٹکے لے لے کر اوپر کی طرف اٹھ رہا ہے۔ سب کی سانسیں اپنی جگہ رکی ہوئی تھیں۔ حادثے کے سارے امکانات سامنے تھے۔ لیکن ڈینی کی یکسوئی اور اس کی ہوشیاری کام آئی، جھٹکوں کے ساتھ ہی سہی، پر جہاز نے رن وے کو چھو لیا۔ فوراً ڈینی نے انجن بند کر دیا تاکہ رفتار تیزی سے کم ہو اور آگ لگنے کا اندیشہ کم سے کم رہ جائے۔ اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے جہاز ایک جگہ آ کر رک گیا۔

اس قابل ذکر فرض ادائیگی، خود کو خطرے میں ڈال کر دشمن کے پانچ ٹینکوں کی تباہی اور پھر جان کی بازی لگا کر اتنے تباہ حال جہاز کو صحیح سلامت واپس لے کر آنے کے لیے ڈینی کو ملک کے اہم ترین اعزاز ''مہاویر چکر'' سے نوازا گیا۔

اور اب اپنے ہاتھوں میں وکرم کے پیروں کو جکڑے ہوئے آنسو بھری آنکھوں اور رندھے گلے سے ڈینی کہہ رہا تھا، ''سر! یہ سب آپ کی دین ہے۔''

□□□

مسدود راہیں

ترجمہ و تعارف — زاہدہ زیدی

''مسدود راہیں'' میں پانچ اہم ترین جدید مغربی ڈراموں کا ترجمہ و تعارف زاہدہ زیدی نے پیش کیا ہے۔ زندگی اور موت، تلاش ذات، عرفان کائنات، تنہائی اور مابعد الطبیعیاتی خلا، انسانی صورت حال، لامحدود کائنات میں انسان کا مقام اور معنی کی تلاش جیسے گہرے اور بنیادی مسائل پر مبنی یہ ڈرامے فنی ندرت اور گہری معنویت کے باوصف جدید مغربی ڈراموں میں شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان ڈراموں کا تعلق بیسویں صدی کے وسط میں ابھرنے والی ایک ایسی ڈرامائی تحریک یا اسلوب سے ہے جس نے جدید مغربی ڈرامے کو انقلاب آفریں تبدیلیوں سے روشناس کرایا اور ڈرامے کے وسیع تر امکانات کو بروئے کار لا کر وجودی تجربے کی گہرائی میں اترنے، لاشعوری کیفیات کو گرفت میں لانے اور ذہن انسانی کے اسرار و رموز کو منکشف کرنے کی کوشش کی۔

صفحات: 406، قیمت -/126 روپے

خورشید احمد شفقت اعظمی

(ہماری مطبوعات سے)

کرم شکم

آنتوں میں سات قسم کے کیڑے پیدا ہوتے ہیں، لیکن یہاں صرف ان قسموں کے تذکرے پر اکتفا کیا جائے گا جو بالعموم انسانی آنتوں میں پیدا ہوا کرتے ہیں یعنی دودالخل، حیات (کینچوے) اور حب القرع۔

دودالخل: مترادفات — چرنے، چنوے، کرم صغار، خیطیہ (Thread worm, Pinworm or Oxyuris vermiculars)۔

یہ ان کیڑوں کے مشابہ ہوتے ہیں جو سرکا میں پیدا ہوتے ہیں، اسی لیے انھیں دودالخل (سرکا کے کیڑے) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ سفید رنگ کے 0.6 تا 0.8 سینٹی میٹر طویل ہوتے ہیں اور ان کی موٹائی دھاگے کے برابر ہوتی ہے۔ اس کے انڈے کمرے کی دھول اور در و دیوار نیز کھیت میں پائے جاتے ہیں۔ اس میں تقریباً جملہ اہل خانہ مبتلا ہوتے ہیں اور مشکل سے کوئی فرد اس کی زد سے بچتا ہے۔

بچوں میں معائے مستقیم کے علاوہ تعریج سینی میں ان کے گچھے کے گچھے ملتے ہیں۔ یہ گاہے مقعد اور اندام نہانی میں نفوذ کر جاتے ہیں۔ ان کے دونوں سرے مخروطی ہوتے ہیں۔

اسباب: اطبائے قدیم کے نظریے کے مطابق بلغمی رطوبت ان کیڑوں کی پیدائش کا سبب ہوتی ہے اور حرارت غریبہ کے عمل سے کیڑوں کی شکل وجود میں آتی ہے، لیکن جدید نقطۂ نظر سے کیچوے کی طرح کرم صغار بھی براز کے ہمراہ خارج ہو کر انڈے دے دیتے ہیں جو سبزی اور ترکاری وغیرہ کے ذریعے شکم میں جا کر منتقل ہو جاتے ہیں اور تولید کرم کا باعث ہوتے ہیں، لیکن ایسی حالت میں بھی بلغم کے سبب کی تردید نہیں کی جا سکتی، کیونکہ بلغمی رطوبت ہی ان کیڑوں کی بقا کے لیے سازگار فضا قائم کرتی ہے۔

تشخیص: اس کی تشخیص براز یا گردمبرزی خطے میں انڈوں یا چرنوں کی دریافت سے ہوتی ہے، جس کے لیے ربذہ (Collophene Tripped swab) حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے خردبینی مطالعے کے لیے براز کو صبح کے وقت حاصل کر کے معمل بھیج دیا جاتا ہے۔

علامات: مبرز و مہبل میں خارش خصوصی علامت ہے، نیز التہاب مہبل و فرج کا خاص سبب چرنوں کو بتایا جاتا ہے، دیگر علامتیں خراش کے سبب بے چینی، بے خوابی، شکمی درد اور ناقابل تشریح اسہال ہیں۔ انگوٹھا چوسنے یا ناخن کاٹنے سے دوبارہ سرایت کا اندیشہ رہتا ہے۔

مبرز کے امتحان پر چرنے باہر نکلنے کی جدوجہد میں مصروف نظر آئیں گے، گاہے زائدہ کے عملیہ کے دوران زائدہ دودیہ اعور یہ کیڑوں سے پر نظر آتا ہے۔

تدابیر و علاج: علاج سے پیشتر جملہ افراد خانہ کے گردمبرزی خطے کا ربذہ حاصل کیا جائے اور امتحان پر جو لوگ متاثر نظر آئیں، ساتھ ساتھ ان کا علاج جاری کر دیا جائے۔

بچے کے ناخن صاف اور کٹے ہوئے ہونے چاہئیں، کھانے پینے میں بھی مکمل صفائی کا اہتمام رکھا جائے، کھرچنے اور کھجلانے سے روکا جائے، جس کی بہترین ترکیب یہ ہے کہ سوتے وقت چینٹ یا پاجامہ پہنایا جائے۔ گردمبرزی اور عجانی خطوں کو روزانہ دھو کر خشک کر لیا جائے۔

حسب ذیل نسخے مفید ہیں:

(نسخہ) پلاس پاپڑہ، بزنگ کابلی، خردل ہر ایک 9-9 گرام، سہاگہ بریاں، نمک سیاہ ہر ایک 4.5 گرام۔ جملہ دوائیں کوٹ چھان کر سفوف بنائیں۔ مقدار خورک: 512 ملی گرام تا ایک گرام، دو تا ڈیڑھ سالہ بچے کے لیے۔ (دیگر) صبر سقوطری، افسنتین رومی، مغز خستہ جامن، برگ شفتالو، قنبیل (کمیلہ)، پلاس پاپڑہ، ہر ایک 4.5 گرام، خردل 9 گرام، مغز بادام تلخ 2 گرام۔

جملہ دوائیں کوٹ چھان لیں اور آب برگ کریلہ کے ساتھ گوندھ کر چنے کے برابر گولیاں بنائیں۔

مقدار خوراک: روزانہ 2 گولیاں۔ (دیگر) چاکسو مقشر، علقیت ہر ایک 2 گرام، صبر 1 گرام، فلفل سیاہ (آدھا گرام)، برگ نیم (5عدد)، جملہ دواؤں کو باریک پیس کر بقدر جوار گولیاں بنائیں۔ مقدار خوراک: چھوٹے بچوں کو ایک گولی اور بڑے بچوں کو 2 تا 3 گولیاں۔

نوٹ: اس میں حقنے اور شیافات زیادہ موثر ہوتے ہیں، کیونکہ امعاء کے آخری حصے تک پہنچتے پہنچتے دوا کا اثر کمزور ہو جاتا ہے۔ مقامی استعمال کے لیے

"امراض الاطفال" سے ماخوذ، مصنف: حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی، صفحات 568، قیمت: -/120

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

حسب ذیل نسخے مفید ہیں:

روغن شفتالو اور روغن زردالو مقامی طور پر ملیں۔ گائے کے پتے میں فتیلہ آلودہ کرکے مقعد میں رکھیں۔ ایلوا سرکا میں پیس کر اس میں فتیلہ آلودہ کرکے مقعد میں رکھیں۔ ترمس اور بابونہ پوٹلی میں باندھیں اور پانی میں جوش دے کر صاف کرکے اسی پانی سے حقنہ کریں، اس کے بعد: کمیلہ کو روغن شفتالو 5 ملی لیٹر میں ملائیں اور کپڑے کی بتی آلودہ کرکے معائے مستقیم میں لگائیں۔

نوٹ: اگر قاتل دیدان ادویہ شروع کرنے پر ازخود مردہ کیڑوں کا اخراج ہو تو بہتر ہے، ورنہ تین چار یوم بعد دوائے مسہل دیں، بصورت دیگر ابخرات دماغ کی جانب صعود کرنے لگیں گے، جس سے دوسری آفتیں پیدا ہوں گی، لہٰذا قاتل دیدان دوا کے استعمال کے دوران ہر 3-4 یوم بعد تلیین طبع ضروری ہے۔

جدید معالجہ: پپرازین (Piprazine) کو ایک غیر سمی اور موثر معالجہ تسلیم کیا جاتا ہے، اس مقصد کے لیے انٹی پار شربت (Syrup Antepar)، ایٹاسل (بی۔ڈی۔ایچ) یا پپران (Pipran) ساختہ ایلمبک بمقدار 50 ملی لیٹر/کلو جسمانی وزن یومیہ دیا جائے۔ طبعی وزن کے حامل 9 ماہ تا 2 سالہ بچوں کو 3.5 ملی لیٹر یومیہ دیا جاسکتا ہے دو ہفتے بعد اسے دہرا بھی سکتے ہیں۔

ویپرینیم ایمبونیٹ (Viprynium Embonate) 5 ملی گرام/ کلو جسمانی وزن کی واحد خوراک سے بہتر نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

حیات (کیچوے): اس کا وقوع ہندوستان میں 80 فیصد کے قریب ہوتا ہے اور بچپن میں بیماری اور موت کا خاص سبب یہ کیڑا ہی ہوتا ہے۔

کیچوے 15 تا 35 سینٹی میٹر طویل ہوتے ہیں، ان کے منہ میں چھوٹے دانت ہوتے ہیں اور راس کے اردگرد تین ابھار بھی نظر آتے ہیں۔ یہ مدور اور زمین کے کیچوے سے عین مشابہت رکھتے ہیں، فقط ان کا رنگ سفید ہوتا ہے۔ چھوٹی آنتیں، ان کا پسندیدہ مسکن ہوتی ہیں، لیکن کبھی کبھی وہاں سے رینگ کر معدہ، مری، حنجرہ یا ناک کی طرف صعود کر جاتے ہیں۔ علاوہ بریں مقعد، مجریٰ بول یا لڑکی کی فرج میں بھی جاسکتے ہیں۔

اکثر دو ہی تین کیڑے ہوتے ہیں، لیکن گاہے یہ تعداد سیکڑوں تک پہنچ جاتی ہے اور کالونی بنا لیتے ہیں۔ ایک مادہ کیچوا دو لاکھ انڈے یومیہ دینے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس کی مدت حیات ایک تا دو سال ہوتی ہے۔

اسباب: اس کا بیضہ براز میں خارج ہوتا ہے اور پھر کسی طرح غذا میں شامل ہوکر انسان کے شکم میں پہنچ جاتا ہے، انڈے چھوٹی آنت میں رک جاتے ہیں، لیکن دوزہ (Larva) دموی رو کے ذریعے کبد اور دائیں حصہ قلب سے ہوتے ہوئے پھیپھڑے میں پہنچتے ہیں، اس کے بعد مکئی (Epiglottis) کے ذریعے نگل لیے جاتے ہیں اور آخر کار چھوٹی آنت میں پہنچ کر نشوونما پاتے ہیں۔

علامات: یہ کیڑے گوناگوں عصبی علامات پیدا کرسکتے ہیں، بچہ سوتے میں کیڑا خارج کردیتا ہے۔ سوتے میں دانت پیستا ہے اور لعاب دہن خارج کرتا ہے، غذا سے نفرت ہوجاتی ہے اور سقوط اشتہا عارض ہوجاتا ہے، لیکن گاہے اس کے برعکس بھوک بڑھ جاتی ہے۔ شیرینی کی خواہش بڑھ جاتی ہے۔ پیاس شدت اختیار کرلیتی ہے، مریض ہمیشہ کسلمند رہتا ہے اور آنکھ کھولنا ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ اکثر چاہتا ہے کہ آنکھ بند کیے پڑا رہے، ایسے بیمار کے نوم و بیداری میں اعتدال و توازن برقرار نہیں رہتا۔ کبھی دست اور گاہے قبض کی شکایت ہوتی ہے۔

اس کی تشخیص عموماً براز میں بالغ کیڑے خارج ہونے سے ہوتی ہے یا خردبینی امتحان سے ان کے انڈے براز میں مل جاتے ہیں۔

گاہے اس کے سبب اسنوفیلیا عارض ہوجاتا ہے۔

علاج: اس کا علاج کدودانہ کی طرح ہے، لیکن اسے قتل کرنے کی موثر ترین دوا درمنہ ترکی (درمنین) ہے۔

مقدار خوراک (بچوں کے لیے): 128 تا 182 ملی گرام۔

ترکیب استعمال: صبح کو سفوف کی شکل میں شکر کے ہمراہ روٹی، دودھ اور مکھن وغیرہ کے ہمراہ کھلایا جائے اور 4 روز بلاناغہ دیا جائے۔ اس کے بعد روزانہ کوئی مسہل دوا تجویز کی جائے۔

ایسے مواد کی تکوین روکی جائے جن سے کیڑوں کی تولید میں مدد ملتی ہے، پھر آنتوں کو مواد سے پاک کیا جائے اور کیڑوں کو قاتل دیدان ادویہ سے ہلاک کیا جائے، اگر قتل دیدان کے بعد طبیعت انھیں دفع کرنے پر قادر نہ ہو تو دوا دے کر دفع کیا جائے، کیوں کہ زندہ کیڑوں کے بہ نسبت مردہ کیڑوں کی مضرت زیادہ ہے۔

خلو شکم کی حالت میں بھوک کے وقت کرم کش دوائیں زیادہ موثر ثابت ہوتی ہیں، جس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اول دو روز بچے کو تازہ بتازہ دودھ پلائیں اور اگر بچہ بڑا ہو تو دودھ میں روٹی بھگو کر دیں، تیسرے روز دوائیں دودھ میں گھول کر پلائیں۔

مزید نسخوں کے لیے حب القرع کا معالجہ ملاحظہ کیا جائے۔

جدید علاج: گاہے سینٹونین مفید ثابت ہوتی ہے، خاص طور سے اگر قولون صاف کرکے دیا جائے نیز دو ایک روز سیال غذا دی جائے۔

(نسخہ)

سینٹونین = 1 گرین

کیلومل = نصف گرین (برائے تین شب)

میگ سلف = نصف ڈرام (برائے تین یوم)

اس مقصد کے لیے بٹرپلو (ساختہ ایسٹ انڈیا کمپنی) موثر اور سہل الاستعمال ہے۔

علاوہ بریں پیر ازین کی واحد خوراک بھی غیر مری اور موثر ہے۔ اس مقصد کے لیے ہلما سڈ مع سنا (Helmacid cum Senna) نصف پیکٹ حسب عمر نگلوا کر پانی پلا دیں، اوپر سے شربت یا چلوں کے رس بھی دے سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ کسی مسہل وغیرہ کی مطلق ضرورت نہیں رہتی۔ اگلی صبح کیچوے خارج ہو جائیں گے۔ دیگر جدید تالیفات درج ذیل ہیں:

تھیابنڈ ازول (Thiabendazole) بمقدار 50 ملی گرام/کلو/یومیہ۔ بیش از بیش 2 گرام/یومیہ دو منقسم خوراکوں میں بعد از طعام، دو دن مسلسل۔ کسی تیاری یا مسہل کی ضرورت نہیں

ٹٹرامائی سول (Tetramysole) او لیومائی سول (Levamysole): یہ بک ورم کے لیے بھی موثر ہیں۔ اسے 2.5 تا 5.0 mgt /کلو بیش از بیش 150 ملی گرام بطور واحد خوراک۔

میبنڈ ازول (Mebendazole) وسیع الاثر دافع دیدان بمقدار 100 ملی گرام دن میں دو بار تین دن دینے سے تقریباً مکمل شفا ہو جاتی ہے۔ مسہل کی ضرورت نہیں ہوتی۔

البنڈ ازول (Albendazole) وسیع الاثر مانع دیدان نہ صرف بہترین قاتل حیات ہے بلکہ Enterobiasis, Anchostomiasis اور Trichuriasis میں بھی موثر ہے۔ اسے 2 سال سے کم عمر کے بچوں کو 200 ملی گرام اور اس سے اوپر 400 ملی گرام دیتے ہیں۔

حب القرع (TAPE WORM):

مترادفات: دیدان شریطیہ، فیتہ نما کیڑے (کدو دانے)۔

اسباب: کچے یا نیم پخت لحم خنزیر یا بھینس کے گوشت کے استعمال سے عارض ہوتا ہے۔

اقسام: اس کی حسب ذیل تین قسمیں ہوتی ہیں:

(1) قرعیہ خنزیر یہ یا قرعیہ سلاحیہ: ان کی لمبائی 1 تا 2 میٹر ہوتی ہے۔ یہ سور کے گوشت سے انسان میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے سر میں چھوٹے چھوٹے ابھار ہوتے ہیں۔

(2) قرعیہ بقریہ متوسط: ان کی لمبائی 4 تا 7 میٹر ہوتی ہے۔ یہ کیڑے گائے کا گوشت کھانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے سر میں اول الذکر کی طرح کلاب (ابھار) نہیں ہوتے۔

(3) قرعیہ عریضہ یا قرعیہ عظیمہ: اس کا طول و عرض مذکورہ بالا دونوں سے زیادہ ہوتا ہے، اس کے سر میں کسی بھی طرح کا ابھار نہیں ہوتا، لیکن قدرے منشق ضرور ہوتے ہیں۔

مذکورہ تینوں قسمیں فیتے کی طرح طویل اور بیشمار ٹکڑوں سے مرکب ہوتی ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ ہر ٹکڑا بذات خود نہ صرف ذی حیات ہوتا ہے، بلکہ توالد و تناسل کی بھرپور صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

اپنی سرایت یا کسی دوسرے کی سرایت کے نتیجے میں بچے یا بالغ اس کے انڈے نگل جاتے ہیں اور اس کی سرایت عارض ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں نباتی اغذیہ اور فاسد پانی کے ذریعے بھی ان کے انڈے داخل بدن ہو جاتے ہیں۔

علامات: حیات والی علامتوں کے علاوہ محض شکمی تہدد اور درد بطور خاص پایا جاتا ہے اور کدو دانوں کی موجودگی میں یا قوخ میں درد ہوتا ہے۔ اس کا مضغہ (Embryo) جسم کے کسی بھی حصے میں داخل ہو سکتا ہے۔ اگر عضلات میں پہنچتا ہے تو درد عضلہ عارض ہو جاتا ہے، گاہے اس کی رہائش گاہ دماغ بن جاتی ہے، اس طرح صرع کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔

علاج: پہلے تین چار روز تک فقط میٹھی چیزوں پر اکتفا کیا جائے، اس کے بعد حسب ذیل نسخے استعمال کرائیں:

(نسخہ) مغز ناریل، پہلاس پاپڑہ 12-12 گرام پیس کر گز۔ میں ملا کر رکھ لیں۔

مقدار خوراک: بچے کو حسب عمر 2-3 گرام تک استعمال کرائیں۔

(نسخہ دیگر) باؤبڑنگ، درمنہ ترکی، تربد سفید ہر ایک 10-10 گرام، سرخس، کمیلہ، حب النیل، قسط تلخ ہر ایک 5-5 گرام، نمک لاہوری 3 گرام۔ جملہ دوائیں کوٹ چھان کر سفوف بنائیں۔

مقدار خوراک: 12۔ گرام بچوں کو حسب عمر دیں۔

(نسخہ دیگر) کمیلہ 3 گرام باریک پیس کر گلقند میں ملا کر کھلائیں۔ بعد میں پوست انار ترش 24 گرام پانی میں جوش دے کر پلائیں۔ بچوں کو ان کی عمر کے مطابق دیں۔

جدید علاج: سب سے پہلے میپا کرین آزمایا جائے، چھوٹے بچوں کو 4 اقراص (100 ملی گرام فی ٹکیہ) دیے جاتے ہیں اور بالغوں کو 8 اقراص۔ ہر گھنٹے کے چوتھائی حصے میں مجوزہ مقدار کا چوتھائی حصہ دیا جائے اور دو گھنٹے بعد مسہل دیا جائے۔

ڈائی کلورفین (Dichlorphen) ایک دوسرا متبادل علاج ہے۔ اس کی واحد خوراک بمقدار 60 گرام/فی گرام صبح کے وقت دی جائے۔ چونکہ یہ دوا خود ملین اثر رکھتی ہے، لہٰذا کسی مسہل کی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے، اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آنتوں میں تباہ ہو کر کیڑے تحلیل ہو جاتے ہیں اور ان کے ٹکڑے آنتوں میں خارج نہیں ہوتے۔

میبنڈ ازول (Mebendazole) بمقدار 200 ملی گرام دن میں دو بار تین یوم تک دینے سے T. Saginata اور T. Solium میں موثر ثابت ہوتا ہے۔

نوٹ: Flixmas بچوں میں نہ تجویز کیا جائے۔ □□□

اردو خبر نامہ

''عربی فارسی مخطوطات کے تراجم'' کل ہند سہ روزہ سیمینار

● ٹونک۔ مولانا ابوالکلام آزاد عربک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ راجستھان ٹونک میں ''عربی فارسی مخطوطات کے تراجم'' کے موضوع پر ایک کل ہند سہ روزہ سیمینار 23-24-25 فروری 2008 کو منعقد ہوا۔

اس اہم موضوع پر ہند اور بیرون ہند سے آئے ہوئے اسکالرس نے اظہار خیال کیا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر محترم ڈاکٹر علی جاوید نے شرکت کی اور سیمینار کا افتتاح فرمایا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت مہیندر سنگھ کھڑگاوت ڈائرکٹر انسٹیٹ آرکائیوز بیکانیر نے کی۔ نظامت کے فرائض مولانا صلاح الدین قمر نے انجام دیے۔ آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر صاحبزادہ عبدالمعید خاں نے مہمانان گرامی کا خیر مقدم کیا۔ گلدستے پیش کیے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر علی جاوید کو ان کے نام کا طغریٰ بھی پیش کیا اور سیمینار کے موضوع پر روشنی ڈالی۔

اس موقعے پر ادارے کی دو نئی مطبوعات ''کتاب الطلاق'' جلد سوم مرتبہ محمد عمر خاں ندوی اور ریسرچ جرنل جلد 24 کا اجرا ہوا جو کے بعد دیگرے علی جاوید صاحب، منظور عالم صاحب، ایڈوکیٹ اور جناب مہندر سنگھ کھڑگاوت کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ شرکا میں امریکہ سے آئے والٹر ہکالہ، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد سے احمد علی صاحب، لکھنؤ یونیورسٹی سے عمر کمال الدین صاحب، دلی یونیورسٹی سے ڈاکٹر ریحانہ خاتون، ڈاکٹر علیم اشرف، بنارس ہندو یونیورسٹی سے ڈاکٹر شمیم اختر، آسام یونیورسٹی سے ڈاکٹر مستفیض الرحمٰن، بمبئی یونیورسٹی سے ڈاکٹر شائستہ خان ذاکر حسین کالج دلی سے ڈاکٹر محمود فیاض اور دیگر مقامی و بیرونی محققین نے شرکت کی۔

سیمینار کا پہلا سیشن 30-3 بجے شروع ہوا۔ صدارت ڈاکٹر عمر کمال الدین، محترمہ شائستہ اختر، محترمہ ریحانہ خاتون اور محترمہ شمیم اختر نے کی۔ اس اجلاس کا پہلا مقالہ مختار ٹونکی نے پیش کیا۔ موضوع تھا ''ام الکتاب کے منظوم تراجم''۔ مقالہ جامع تھا۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر مستفیض الرحمٰن نے عربی زبان میں پیش کیا۔ موضوع تھا ''التراجمۃ من المخطوطات العربیۃ الی اللغات الاخریٰ'' اس میں موصوف نے ادارۂ ہذا کے عربی تراجم کا تعارف پیش کیا تیسرا مقالہ ڈاکٹر ریاض الدین نے پڑھا۔ موضوع تھا ''منتخب التواریخ (فارسی) کے اردو ترجمے کا تجزیہ'' چوتھا مقالہ احمد علی صاحب نے پیش کیا جس کا موضوع تھا ''سالار جنگ میوزیم میں عربی فارسی کے چند اہم منظوم مخطوطات اور ان کے تراجم''۔ مقالہ محنت سے لکھا گیا تھا جس کو پسند کیا گیا اور سامعین نے سماعت فرمایا۔ مقالہ خوانی کے بعد مجلس صدارت کے اراکین نے مقالات پر اپنے تاثرات و خیالات کا اظہار فرمایا آخر میں شکریے کی رسم جناب صلاح الدین قمر، رکن ادارہ نے ادا کی اور سیشن کے اختتام کا اعلان کیا۔

24 فروری 2008 کو مقالات کا دوسرا سیشن ساڑھے دس بجے صبح شروع ہوا۔ صدر تھیں محترمہ شمیم اختر صاحبہ۔ مجلس صدارت میں احمد علی صاحب، صاحبزادہ شوکت علی خانصاحب اور محمد عمر ندوی صاحب شامل تھے۔ پہلا مقالہ محترمہ شائستہ اختر صاحبہ نے پڑھا جس کا موضوع تھا ''ہندو ایرانی داستانوں کے فارسی تراجم''، تفصیلی اور جامع مقالہ تھا۔ دوسرا مقالہ مفتی محمد عادل ٹونکی نے ''خاندان عرفانیہ کے چند عربی و فارسی تراجم'' پر پیش کیا۔ تیسرا مقالہ محترمہ ریحانہ خاتون صاحبہ نے پیش کیا۔ موضوع تھا ''فارسی زبان میں سنسکرت کتاب ہتا کشرا کا ترجمہ ایک گذارش'' چوتھا مقالہ ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی نے پیش کیا جس کا موضوع تھا ''عربی فارسی کے اردو تراجم بعہد نواب محمد علی خاں صاحب''، پانچواں مقالہ سید معقول احمد ندیم نے پیش کیا۔ موضوع تھا ''اردو زبان و ادب کے فروغ میں تراجم کی اہمیت'' چھٹا اور آخری مقالہ ڈاکٹر سید بدر احمد نے پیش کیا۔ موضوع تھا ''اے پی آر آئی ٹونک میں کیے گئے اردو تراجم ایک مختصر جائزہ'' اس سیشن کے آخر میں مبصرین و صدر کے خیالات کے اظہار کے بعد شکریے کے ساتھ اس سیشن کا اختتام ہوا۔

مقالات کا تیسرا سیشن تین بجے سہ پہر ڈاکٹر ریحانہ خاتون صاحبہ کی صدارت میں شروع ہوا۔ مجلس صدارت میں محترمہ شائستہ اختر اور مختار ٹونکی شامل تھے۔ پہلا مقالہ محترمہ صاحقہ ناز (ٹونک) نے پڑھا جس کا موضوع تھا ''مولانا ابوالکلام آزاد عربک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک میں عہد نواب محمد علی خاں بہادر کے چند اہم اردو تراجم'' دوسرا مقالہ ڈاکٹر محمود فیاض صاحب نے پڑھا جس کا موضوع تھا ''مثنوی مولانا روم کے اردو تراجم'' تیسرا مقالہ ڈاکٹر عمر کمال الدین نے پیش کیا موضوع تھا ''عربی فارسی مخطوطات کے گمنام مترجم'' چوتھا مقالہ ڈاکٹر شمیم اختر صاحبہ نے پڑھا جس کا موضوع تھا ''ترجمۂ خطی فسانۂ عجائب (فارسی)'' مقالات پر مبصرین نے سیر حاصل تبصرے کیے

اور ان کو سراہا۔ صدر جلسہ نے بھی اپنی مختصر تقریر میں مقالات پر جامع تبصرہ کیا۔ بعد شکریہ جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

مقالات کا چوتھا سیشن 25 فروری کو صبح 10 بجے شروع ہوا۔ جس کی صدارت احمد علی صاحب نے فرمائی۔ مجلس صدارت محترمہ شمیم اختر صاحبہ محمود فیاض صاحب، ڈاکٹر عرکمال الدین پر مشتمل تھی۔ پہلا مقالہ محمد عرخاں ندوی نے پڑھا جس کا موضوع تھا ''قرآن مجید کی شرح و تفاسیر'' دوسرا مقالہ صاحبزادہ عبدالمعید خاں نے پیش کیا جس کا موضوع تھا ''مولانا ابوالکلام آزاد عربک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک کے نادر اور اہم مخطوطات و مطبوعات کے تراجم''۔ تیسرا مقالہ ڈاکٹر علیم اشرف کا تھا، موضوع تھا ''اخبار الاخیار فی اسرار الابرار کا اردو ترجمہ'' چوتھا مقالہ صاحبزادہ شوکت علی خاں صاحب نے پیش کیا۔ پانچواں مقالہ امریکہ سے آئے ہوئے والٹر ہکالہ نے پڑھا موضوع تھا ''خالق باری کا اردو ترجمہ'' اس اجلاس کے جملہ مقالات کو بہت پسند کیا گیا۔

اس سیمینار میں محققین اور اسکالرس کے علاوہ شہر سے کثیر تعداد میں معززین اور طلبہ واساتذہ و دیگر سامعین کرام نے شرکت فرما کر اس سیمینار کے ہر اجلاس کو کامیاب بنایا۔

اختتامیہ اجلاس 25 فروری 2008 کو 12 بجے (دن) شروع ہوا۔ صدارت مولانا محمد سعید صاحب، خطیب، جامع مسجد قافلہ نے کی اور مہمان خصوصی جناب اونکار سنگھ صاحب، ضلع کلکٹر، ٹونک تھے، مہمان اعزازی جناب گراج بینا صاحب ایس پی ٹونک اور مرزا رفیع اللہ بیگ صاحب تھے۔ اس اجلاس میں مہمانان گرامی کو ان کے ناموں کے طغرے بھی پیش کیے گئے۔ ادارے کے ریسرچ جرنل جلد 25 کا اجرا مولانا محمد سعید صاحب کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ مہمانان خصوصی کی خدمت میں استقبالیہ نظمیں جناب عابد عاقل اور عمر ندوی نے پیش کیں جو بہت پسند کی گئیں۔

عربی فارسی مخطوطات کے تراجم پر اس سہ روزہ کُل ہند سیمینار میں مہمانانِ گرامی قدر کی خدمت میں جلسۂ افتتاحیہ، اختتامیہ کے موقع پر محمد عابد علی خاں عاقل ٹونکی نے منظوم استقبالیے پیش کیے جو بہت پسند کیے گئے۔

(ڈاک سے)

غالب اکادمی کے یوم تاسیس پر سہ روزہ پروگرام

● 24 فروری۔ غالب اکادمی، نئی دہلی میں تین دن کے پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ 22 فروری 2008 کو طرحی مشاعرہ 23 فروری 2008 کو کل ہند سیمینار ''اردو میں دانشوری کی روایت غالب تا حال'' اور 24 فروری 2008 کو محترمہ اختر سنگھوی نے غالب کی غزلیں موسیقی کے ساتھ پیش کر کے سامعین کو مسحور کیا۔ سیمینار کے موضوع پر بولتے ہوئے جناب جوگندر پال نے کہا کہ ہم بہت خوش نصیب ہیں کہ غالب جیسا ایک ایسا شاعر ہمیں مل گیا جس نے ایک فکری، غور و فکر کی دعوت دی اسی لیے غالب ہمہ وقت ہے۔ غالب نے موضوعات کو صرف نبھایا نہیں بلکہ وارداتی طور پر پیش کیا۔ جوگندر پال نے مزید کہا کہ حالی نے ادب کو زندگی سے قریب تر لانے کی کوشش کی۔ سرسید نے عملی آدمی کا کام کیا۔ دانشوری کے بارے میں انھوں نے کہا کہ دانشوری دھیرے دھیرے پنپتی ہے، تحریکیں اس میں معاون ہوتی ہیں۔ تحریکوں کا بھی ہماری روایت میں حصہ رہا ہے۔ ترقی پسند تحریک کی وجہ سے جن بھوتوں کی باتیں کم ہوئیں۔ سماجی حقیقت نگاری کی بات کی گئی۔ جب اس روایت نے پروپیگنڈے کی صورت اختیار کر لی تو حلقۂ ارباب ذوق سامنے آیا۔ فکری سطح پر، عملی سطح پر دانشوری کی روایت بنتی چلی گئی۔ پہلے اجلاس میں پروفیسر شمیم حنفی نے مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ غالب نے اردو شاعری کو نئی سطح پر سوچنا سکھایا۔ غالب کی حسیت سے دانشوری کے تصور کا آغاز ہوتا ہے۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن نے ''دانشور ابوالکلام اور آثار آزاد'' کے عنوان سے مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ غالب کے بعد اردو میں جن بڑے دانشوروں پر نگاہ جم کر رہ جاتی ہے ان میں سرسید، محمد اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کے نام بہت اہم ہیں۔ مولانا آزاد کی شخصیت اپنی وسعت، تہہ داری گہرائی اور اپنی مختلف جہات کی وجہ سے توجہ کا مرکز بنتی رہی ہے اور بنتی رہے گی۔ ڈاکٹر رضوان قیصر نے ''اردو میں دانشوری کی روایت اور اس کے احیا کے امکانات'' پر مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ جمال الدین افغانی اور سرسید احمد خاں نے سائنس کو مسلمانوں کے قریب لانے کی کوشش کی۔ انھوں نے اپنے مقالے میں کہا کہ اردو میں دانشوری کی روایت نہیں رہی اس کی وجہ اردو زبان کا محدود ہونا ہے۔ اردو کو شعبۂ اردو سے نکال کر سماج تک پہنچانا چاہیے۔ پہلے اجلاس کی صدارت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر قاضی افضال حسین نے کی۔ انھوں نے کہا کہ دانشوری کسی نوع کے عقیدے سے شروع نہیں ہوتی بلکہ کسی نوع کے عقیدے پر ختم ہوتی ہے۔ انسان جانور نہیں ہے کہ جدھر چارہ دیکھے چلا جائے۔ اسرائیل نے اپنی زبان کو زندہ رکھ کر جو کارنامہ انجام دیا ہے اس سے ہمیں بھی سبق لینا چاہیے۔ معاش کے لیے ضرور دوسری زبانیں سیکھنا چاہیے لیکن اردو ہماری اپنی تہذیب کی شناخت کی زبان ہے، اسے علمی سطح پر سیکھنا چاہیے۔ سیمینار کے پہلے اجلاس کی نظامت ڈاکٹر ابوبکر عباد نے کی۔ اس اجلاس میں متین امروہوی نے غالب کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

سیمینار کے دوسرے اجلاس کی صدارت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر قاضی جمال حسین نے کی۔ اس اجلاس میں جناب خواجہ حسن ثانی نظامی

نے ہندوستان کی مشہور دانشور ادیبہ مرحومہ قرۃ العین حیدر پر ایک مضمون پیش کیا۔ ڈاکٹر شمس بدایونی نے دوسرے اجلاس ''دانشوری کی روایت اور شبلی نعمانی (مکاتیب کے حوالے سے) اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ عرصۂ دراز سے سرسید جدید کے اور شبلی قدیم کے ترجمان سمجھے جاتے رہے ہیں۔ دونوں کے درمیان خط تقسیم کھینچ کر ان کے مداحین و مخالفین، جدید و قدیم، مشرق و مغرب علی گڑھ اور ندوہ جیسے موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے رہے اور ایک دوسرے کی فوقیت منوانے کے لیے ذہنی تعصبات کا شکار ہوتے گئے۔ اس طرح کبھی سرسید اور کبھی شبلی کی عظمت کو قربان کرتے رہے۔ لیکن آج یہ محسوس کیا جارہا ہے کہ سرسید اور شبلی دونوں علمی اور قومی خدمات کے لیے مخلص تھے۔ دونوں نے قوم کے لیے زندگی کی آسائش کو تج دیا تھا اور اپنی زندگی کا ہر لمحہ قوم کی ترقی اور بقا کے لیے وقف کردیا تھا۔ فرق صرف طریقۂ کار کے انتخاب کا تھا اور یہ انتخاب مذاق طبیعت کے اختلاف کے عین مطابق تھا جس نے دو فکری دھاروں کی شکل اختیار کرلی تھی۔ ان دو فکری دھاروں کے اثرات مسلمانوں کی موجودہ زندگی میں بھی محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ پروفیسر قاضی جمال حسین نے ''حسن عسکری ایک دانشور'' کے عنوان سے مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ دانشوری کی کوئی قابل قبول جامع تعریف بیان کرنا یا چند صفحات کے ذریعے اس کے حدود کی نشاندہی شاید ممکن نہ ہو۔ اردو میں دانشوری کی روایت کے گل سرسید فلسفی اور مفکر ہمارے شاعر مشرق کے کلام میں تو علم و عقل دونوں کی نارسائی کو اس تواتر سے بیان کیا گیا ہے کہ ان کا سارا کلام عشق و عقل کا رزم نامہ معلوم ہوتا ہے۔ حسن عسکری کی دانشوری کا زیادہ ثبوت ان کے مقالات کی دوسری جلد میں ملتا ہے جس میں ادبیات کے بجائے سیاست، ثقافت، مذہب، لسانیات اور دیگر فنون لطیفہ سے بحث کی گئی ہے۔ پروفیسر قاضی جمال حسین نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ دانشوری ایسی چیز نہیں کہ گلی گلی، کوچے کوچے، قریہ قریہ نظر آئے بلکہ اس پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر عائشہ سلطانہ نے کی۔ (ڈاک سے)

''آج کی اردو ہندی کہانی''

● نئی دہلی۔ 19 فروری، شعبۂ اردو ہندی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام ''آج کی اردو ہندی کہانی'' کے موضوع پر 2 روزہ قومی سیمینار کا افتتاحی اجلاس نہرو گیسٹ ہاؤس میں منعقد ہوا، اس اجلاس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی۔ جوگندر پال نے کلیدی خطبہ دیا۔ انھوں نے ناگزیریت کو کہانی کی پہلی شرط قرار دیا اور نئے لکھنے والوں سے کہا کہ وہ ماضی کے ورثے کی مدد سے نئی کہانی کا خاکہ تیار کریں اور ان تمام امور پر نظر رکھیں، جن سے بڑی کہانی کی تخلیق ہوسکے۔ جوگندر پال نے کہا کہ کہانی کی زبان اردو اور ہندی میں یکساں ہے۔ کہانی لکھنے والوں کو اسے ایک مہذب تحریک کی شکل میں آگے بڑھانا چاہیے۔ دو روزہ سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے پروفیسر نامور سنگھ نے اردو ہندی افسانے پر ایک ساتھ ہونے والے اس سیمینار کو نہایت خوش آئند قرار دیا اور کہا کہ اردو ہندی افسانے اگرچہ ایک ساتھ پلے بڑھے مگر سچ تو یہ ہے کہ اردو میں افسانوں کا آغاز پہلے ہوا۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اس عہد کو کہانی کے زمانے سے تعبیر کیا اور کہا کہ دونوں زبانوں میں کہانی میں موضوعات ایک جیسے ہیں صرف رسم الخط الگ الگ ہیں۔ ڈاکٹر علی جاوید نے اس سیمینار کو تاریخی سیمینار قرار دیا اور کہا کہ اس طرح کی کوششیں جاری رہنی چاہئیں نیز ادیبوں اور دانش وروں کو اس سیاسی فضا کو ختم کرنے کی پہل کرنی چاہیے جس کے نتیجے میں زبانوں کو نفرت اور تشدد کا ذریعہ بنایا جارہا ہے۔ حاضرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو پروفیسر شمس الحق عثمانی نے کہا کہ کہانی زبان کی سب سے اہم طاقت ہے۔ ان دنوں ہم اس طاقت سے محروم ہورہے ہیں یہ سیمینار اسی طاقت کو سمجھنے کا آغاز ہے۔ سیمینار کے کنوینر اور افتتاحی اجلاس کے ناظم پروفیسر اصغر وجاہت نے کہا کہ اردو اور ہندی ایک دوسرے کے بغیر ادھوری ہیں۔ یہ سیمینار ان دونوں زبانوں کے مضبوط رشتوں کو سمجھنے کا ایک بلیغ اشارہ ہے۔ صدر شعبۂ ہندی پروفیسر مہندر رپال شرما نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ جلسے کا آغاز محمد جہانگیر حسن نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ اردو ہندی سیمینار کا پہلا اجلاس راجیندر یادو اور پروفیسر معین الدین جینابڑے کی صدارت میں شروع ہوا ڈاکٹر ابوبکر عباد نے ''آج کی حقیقت اور اردو افسانہ'' کے حوالے سے مقالہ پڑھا۔ جس میں انھوں نے پریم چند سے لے کر جدیدیت کے زیر اثر لکھے جانے والے افسانوں کا احاطہ کرتے ہوئے عصری افسانے پر اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر عباد نے کہا کہ عصری افسانہ قاضی عبدالستار، عصمت وغیرہ افسانہ نگاروں جیسے بڑے فنکار پیدا کرنے میں ناکام رہا۔ دوسرے مقالے میں مہیش دتین نے ہندی کہانی اور آج کی حقیقت پر اظہار خیال کیا۔ انھوں نے ہندی کے منتخب افسانہ نگاروں کے افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے آج کی حقیقت اور مسائل کو اجاگر کیا۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ اپنے وقت کو کہانی کے ذریعے قید کرنے کا عمل جس طرح کہانی کاروں نے کیا ہے وہ دوسرے نہیں کرسکے۔ صدارتی تقریر میں پروفیسر معین الدین جینابڑے نے کہا کہ کہانی لکھنے والا اس استحصال کا احساس دلاتا ہے جس سے ہم سب دوچار ہیں۔ صدارتی خطاب میں راجیندر یادو نے کہا کہ اردو میں نئی کہانی ہندی کہانی سے بہت پہلے شروع ہوچکی تھی۔ آج جس طرح سے ہندی میں کہانی لکھی جارہی ہے اس کے پیش

نظر ہندی میں کہانی لکھنے والوں کی تعداد اردو کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ اس لیے اردو ہندی کہانی کا تقابل کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ دونوں زبانوں کے لٹریچر کو ایک ساتھ پڑھنے کی ضرورت ہے۔ اس جلسے کی نظامت پروفیسر خالد محمود نے کی اور اظہار تشکر پروفیسر عبدال بسم اللہ نے کیا۔ آخر میں شام افسانہ منعقد ہوئی جس کی صدارت پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی اور پروفیسر فیجر پانڈے نے کی۔ اس موقع پر خورشید اکرم نے ''بلینک کال'' کہانی پڑھی دوسری کہانی ارون پرکاش نے پڑھی۔ نظامت ڈاکٹر اےجے نادریا نے کی جبکہ ڈاکٹر شہپر رسول نے کلمات تشکر ادا کیے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو کے بغیر سیکولرزم کا تصور بے معنی

● جموں۔ 8 مارچ، سینٹر فار پروفیشنل اسٹڈیز ان اردو جموں یونیورسٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی کے اشتراک سے جموں یونیورسٹی کے شعبۂ ماحولیات کے آڈیٹوریم میں ''اردو زبان کا سیکولر کردار'' کے موضوع پر دوروزہ قومی سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں ملک کے نامور ادیبوں اور دانشوروں نے اپنے مقالات پیش کیے اور یہ باور کرانے کی کامیاب کوشش کی کہ اردو زبان و ادب اپنے دور آغاز سے ہی ہندوستانی تہذیب و تمدن کے آئینہ دار ہیں۔ بدلتے ہوئے حالات اور الٹتے ہوئے تاریخی اوراق پر اپنے نشانات قائم کرنے میں اردو کے ادبا اور شعرا نے تاریخی کارنامے انجام دیے ہیں۔ لیکن آج ایک اہم سوال یہ ہے کہ اردو زبان کی تہذیبی اور تاریخی اہمیتوں کو کم کرنے کی سازشیں چل رہی ہیں۔ ایسے وقت میں اردو والوں کے لیے یہ ضروری ہوگیا ہے کہ وہ اپنی ادبی وراثت کے تحفظ کے لیے بیدار ہوں اور اردو کی حق تلفی کے خلاف صف آرا ہوں۔

افتتاحی تقریب کے صدر و جموں یونیورسٹی کے وائس چانسلر پدم شری پروفیسر امیتابھ مٹو نے اردو زبان و ادب کی تہذیبی و تمدنی خدمات کو ہندوستانی تاریخ کا روشن باب قرار دیتے ہوئے کہا کہ اگر اردو کی خدمات کو نظرانداز کیا جاتا ہے تو گویا ہم اپنی گنگا جمنی تہذیب کے ساتھ ناانصافی کررہے ہیں۔ انھوں نے اردو کو خالص ہندوستانی زبان سے تعبیر کیا۔ قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے زبان و ادب کی تاریخ کے حوالے سے اپنی گفتگو میں اردو زبان کو ساجھی وراثت کا اہم ستون قرار دیا اور کہا کہ اردو کے بغیر سیکولرزم کا تصور مبہم اور بے معنی ہے۔ ریاست جموں و کشمیر کے اعلیٰ تعلیم کے وزیر ٹھاکر گل چین سنگھ چاڑک نے ریاست میں اردو کو اس کا حق دلانے کی یقین دہانی کرائی اور اس زبان کی ثقافتی و تہذیبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے بغیر ہماری مشترکہ تہذیب ادھوری ہے۔ استقبالیہ خطبے میں پروفیسر شہاب ملک نے اردو زبان و ادب میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور انسانی ہمدردی کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالی۔ جبکہ ناظم جلسہ ڈاکٹر ریاض احمد نے اس موضوع پر سیمینار منعقد کرنے کی ضرورت اور اس کی افادیت پر تفصیلی روشنی ڈالی اور خصوصی حوالوں سے یہ ثابت کیا کہ اردو زبان نے ہمیشہ اپنے عہد کے تقاضوں کو پورا کیا ہے۔

افتتاحی تقریب کے بعد جلسۂ اول کی صدارت پروفیسر لطف الرحمٰن، ڈاکٹر علی جاوید اور ڈاکٹر شاہد پرویز نے کی اس اجلاس میں بلراج بخشی، حسن مثنیٰ، ڈاکٹر توقیر احمد، ڈاکٹر ارجمند آرا، ڈاکٹر فاروق بخشی، ڈاکٹر ابوبکر عباد، ڈاکٹر نجمہ رحمانی اور شفق سوپوری نے اپنے مقالے پیش کیے۔ دوسرے دن پہلے اجلاس میں دیپک بدکی، ڈاکٹر مشتاق احمد، فرحت رضوی، ڈاکٹر شاہد مشتاق وانی نے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر خورشید حمرا اور نندکشور وکرم نے کی۔ آخری اجلاس میں ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی، ڈاکٹر ظہیر احمد انصاری، پروفیسر شہناز انجم یوسف غوری، ڈاکٹر ریاض احمد، پروفیسر عتیق اللہ اور آنند لہر نے مقالے پڑھے۔ اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر لطف الرحمٰن نے کہا کہ زبان کسی مذہب کی نہیں بلکہ تہذیب کی علامت ہوتی ہے اس لیے کسی زبان کو کسی خاص مذہب و فرقے سے نہیں جوڑا جاسکتا۔ جب کہ پروفیسر عتیق اللہ نے سیکولر کی معنویت کو اجاگر کیا اور کہا کہ ہمیں ہی سیکولر ہونے کا ثبوت کیوں پیش کرنا پڑتا ہے۔ آنند لہر نے اردو زبان کو مشترکہ تہذیب کا ورثہ قرار دیا۔ اختتامیہ اجلاس میں معروف ناقد و محقق یوسف ٹینگ کو پدم شری ملنے پر اعزاز بخشا گیا۔ اس اجلاس کی صدارت معروف صحافی وید بھسین نے کی۔ انھوں نے اردو زبان کو بھائی چارے اور انسان دوستی کی زبان قرار دیا۔ (ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

قومی ہم آہنگی اور ملک کی ترقی میں اردو کا اہم رول

● بنگلور۔ اردو زبان نے قومی ہم آہنگی اور ملک کی ترقی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اسے غیر ملکی زبان کہنے والے تاریخ سے لاعلم ہیں یہ خالص ہندوستانی زبان ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈائرکٹر محکمہ کلچر منوبلیگار نے کرناٹک اردو اکادمی کے زیر اہتمام ایک دو روزہ سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو پر مسلمانوں اور غیر ملکیوں کی زبان کا الزام عائد کرکے اس کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اردو داں طبقے نے بھی اپنی زبان کا حق ادا نہیں کیا ہے۔ زبان کی ترقی و ترویج کے لیے حکومت کے پاس فنڈ کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ہمیں اس کی ترقی کے لیے کام کرنے کا جذبہ رکھنے والے ملیں جو کہ ایمانداری اور خوش اسلوبی کے ساتھ کام کریں۔ انھیں حکومت کا ہر

ممکن تعاون حاصل رہے گا۔ اپنے صدارتی خطبے میں کرناٹک اردو اکادمی کے چیئرمین م ن سعید نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ جب سے انھوں نے چیئرمین کا عہدہ سنبھالا ہے اس بات کو محسوس کیا ہے کہ ان کے کاموں کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی حالانکہ کرناٹک آج اردو کے لیے ایک زرخیز زمین ہے۔ پروفیسر سعید نے کہا کہ تاریخ گواہ ہے کہ اردو کی پہلی کتاب کرناٹک میں لکھی گئی لیکن آج اردو زبان ریاست میں کسمپرسی کی حالت میں ہے۔ پروفیسر سعید نے مزید کہا کہ کرناٹک میں اردو کی جڑیں کافی مضبوط ہیں لیکن صرف چند شعبوں میں کام کیا گیا ہے ہمیں چاہیے کہ دیگر میدانوں میں تحقیق کریں تاکہ کرناٹک میں اردو کے متعلق حقیقت کو اردو دنیا کے سامنے لایا جائے اور جس دائرے میں ہم کام کررہے ہیں اس سے باہر نکلا جاسکے۔ اس موقع پر مہمان خصوصی سابق ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو پروفیسر فہمیدہ بیگم نے اس تلخ حقیقت کا اظہار کیا کہ کرناٹک کا اردو داں طبقہ اپنی صلاحیت و قابلیت کو اجاگر کرنے میں ناکام رہا ہے۔ کیونکہ وہ احساس کمتری کا شکار ہے حالانکہ صلاحیت و قدرت کی اس میں کوئی کمی نہیں ہے۔ پروفیسر فہمیدہ بیگم نے مزید کہا کہ انھیں ان کے اسکول کے لیے اردو پڑھانے کے لیے اساتذہ نہیں مل رہے ہیں۔ پہلے اجلاس کی صدارت منظور احمد نے کی جبکہ سلیم تمنائی نے ''قدیم میسور میں اردو آزادی سے پہلے'' اور محترمہ فہیم انصاری نے ''ریاست میسور میں اصلاحی ادب کی روایت'' کے عنوان پر اپنے مقالات پیش کیے۔ اس پروگرام کی نظامت رجسٹرار رحمت الحق نے کی جبکہ اس موقع پر شہر کے مشہور ادیب، مصنف، شعراء، اساتذہ اور طلبہ شریک ہوئے۔ دوسرے اجلاس میں ''قدیم ریاست میسور میں اردو تعلیم کا نظام'' کے موضوع پر پروفیسر ابوتراب خطائی، خطۂ ملناڈ کی ادبی خدمات'' پر ڈاکٹر سید خلیل احمد اور ''ضلع میسور کی ادبی خدمات'' پر اکرام کاوش نے مقالات پیش کیے۔ کرناٹک اردو اکادمی کے دو روزہ سیمینار بعنوان ''ماقبل تشکیل نو، ریاست میسور کی تاریخ زبان و ادب'' کے اختتامی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی کے ریجنل ڈائرکٹر ڈاکٹر قاضی ضیا نے کہا کہ میسور کے ادب پر مذہبیات اور اصلاح کا اثر بہت گہرا رہا ہے اور بھرپور اور خالص ادبی اظہار کو بروئے کار آنے میں کافی عرصہ لگ گیا۔

(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی میں
قرۃ العین حیدر چیئر قائم ہونی چاہیے۔ پروو ائس چانسلر

● قرۃ العین حیدر کی خدمات نہ صرف بہت زیادہ ہیں بلکہ اعلیٰ درجے کی ہیں۔ ''پت جھڑ کی آواز'' پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور ''آگ کا دریا'' پر گیان پیٹھ ایوارڈ پیش کرکے ان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا، ممبئی یونیورسٹی میں قرۃ العین حیدر چیئر قائم ہونی چاہیے تاکہ ان کے افکار و خیالات سے لوگ فائدہ اٹھاسکیں۔ ان خیالات کا اظہار پروو ائس چانسلر ڈاکٹر اے۔ ڈی ساونت نے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام منعقدہ دو روزہ قومی سیمینار ''قرۃ العین حیدر: شخصیت اور فن'' کے افتتاحی جلسے کے خطبۂ صدارت میں کیا۔

یوسف ناظم نے سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ ''قرۃ العین حیدر اردو کی ایک ایسی فکشن نگار ہیں کہ اپنی زندگی میں لیجنڈ ہوگئی تھیں۔ ایسی بلند و بالا شخصیت پر ممبئی یونیورسٹی کا شعبۂ اردو دو روزہ سیمینار کررہا ہے، جس کے لیے وہ مبارک باد کا مستحق ہے۔'' سلمیٰ صدیقی نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا کہ قرۃ العین حیدر نے اپنی چھوٹی عمر سے ہی کہانیاں لکھنا شروع کردی تھیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ویسے ویسے ان کے قلم کی روانی بڑھتی گئی۔ ان کے ناولوں، ناولٹوں اور افسانوں میں کئی تخلیقات ایسی ہیں جو کسی بھی زبان کے لیے اہم سرمایہ ہوسکتی ہیں کئی تعلیمی اداروں کے بانی ڈاکٹر اے۔ آر اندرے مہمان خصوصی کی حیثیت سے سیمینار میں موجود تھے انھوں نے کہا کہ میں نے ابتدائی تعلیم اردو میڈیم سے حاصل کی مگر ساری زندگی میرا واسطہ انگریزی سے رہا۔ جب کبھی کچھ وقت ملتا ہے تو اردو زبان و ادب اور اسلامیات کی کتابیں بھی پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لہٰذا میں کہہ سکتا ہوں کہ ''آگ کا دریا'' جیسا بڑا ناول اردو میں نہیں ہے اور نہ ہی قرۃ العین حیدر جیسی بڑی کوئی ادیبہ۔

ابتدا میں شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر صاحب علی نے مہمانوں کا استقبال کیا اور قرۃ العین حیدر کی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ جنھی آپانے اردو فکشن کو نئی راہوں پر اور نئی سمتوں میں گامزن کیا۔ انھوں نے تہذیب، ثقافت، تاریخ، سیاست اور فنون لطیفہ کی تہ در تہ وسعتوں کو سمیٹ کر اردو فکشن کی تعمیر نو کی اور اسے نئی بلندیاں عطا کیں۔ شعبۂ اردو کی لکچرار محترمہ معزہ قاضی کے رسم شکریہ پر افتتاحی اجلاس اختتام کو پہنچا۔

چائے کے وقفے کے بعد مقالہ خوانی کا پہلا اجلاس پروفیسر خالد سعید (حیدرآباد) کی صدارت میں شروع ہوا۔ اس میں تین مقالے پڑھے گئے۔ پہلا مقالہ پروفیسر یونس اگاسکر کا تھا۔ انھوں نے قرۃ العین حیدر سے اپنی تین ملاقاتوں پر مشتمل مضمون پیش کیا۔ دوسرا مقالہ پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی کا بعنوان ''قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں فنون لطیفہ کے تلازمات و معروضات'' تھا۔ تیسرے مقالہ نگار الیاس شوقی نے عینی کے ایک افسانے ''کہرے کے پیچھے'' کا تجزیہ کرتے ہوئے افسانے کی کردار نگاری کو بہت اہم قرار دیا۔

ظہرانے کے بعد دوسرا اجلاس پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی کی صدارت میں شروع ہوا۔ شمیم طارق نے اپنا مقالہ ''آگ کا دریا اور عینی کا تہذیبی شعور'' کے عنوان سے پیش کیا اور واضح کیا کہ ان کے ناول میں شعور کی رو کی تکنیک انگریزی ادب سے نہیں بلکہ ان کے تہذیبی شعور سے آئی تھی۔ پروفیسر غیاث

الدین نے اپنے مقالے میں فرقہ واریت کے خلاف عینی کے رویوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ فرقہ واریت کی الگ الگ صورتیں ہمیں ''میرے بھی صنم خانے'' اور ''چاندنی بیگم'' میں دکھائی پڑتی ہیں۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر یونس اگاسکر نے کی۔ پروفیسر خالدہ سعید نے ''فکشن ناٹ ہسٹری'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا جس میں انھوں نے ''آگ کا دریا'' کو کھٹی ڈکاریں کہا تو ''چاندنی بیگم'' کو مکمل ہاضمے کا حاصل ثابت کرنے کی کوشش کی۔ سلام بن رزاق نے ''گردشِ رنگ چمن'' پر ایک تبصرہ اضافی نوٹ کے ساتھ پڑھا۔

دوسرے دن کا پہلا اور سیمینار کا چوتھا اجلاس سلام بن رزاق کی صدارت میں شروع ہوا۔ پہلا مقالہ انور قمر کا تھا۔ انھوں نے عینی کے افسانے ''فوٹو گرافر'' کا تجزیہ پیش کیا۔ دوسرا مقالہ ساجد رشید کا ''آگ کا دریا'' سے متعلق تبصرہ نما مضمون تھا صدر اجلاس نے دونوں مقالوں پر گفتگو کی۔ چائے کے وقفے کے بعد پانچواں اجلاس پروفیسر عبدالستار دلوی کی صدارت میں ہوا جس میں تین مقالے پڑھے گئے۔ پہلا مقالہ ''آخر شب کے ہم سفر۔ ایک مطالعاتی تاثر'' کے عنوان سے مقدر حمید کا تھا۔ اس ناول پر مقالہ نگار نے سیر حاصل بحث کی۔ دوسرا مقالہ سرورالہدیٰ فریدی کا ''طلسمی آئینے کا ایک زاویہ'' کے عنوان سے تھا۔ جب کہ اقبال مسعود نے ''قرۃ العین حیدر آتشِ رفتہ کا سراغ'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ یہ دونوں مقالے سوانحی انداز کے تھے۔ ظہرانے کے بعد چھٹا اور آخری اجلاس شروع ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت ساجد رشید نے کی۔ تین مقالے پڑھے گئے ایم مبین نے ''قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ'' کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر محمد معظم الدین نے عینی کے مشہور افسانے ''حسب ونسب'' کا سیر حاصل تجزیہ پیش کیا۔ ڈاکٹر غلام حسین نے قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا اور کہا کہ عینی نے اپنی تخلیقات کے توسط سے اردو کے افسانوی ادب کو عالمی سطح پر متمکن کیا۔

الوداعی خطبے کی صدارت سی۔ ڈی۔ سی، یونیورسٹی آف ممبئی کے چیئرمین پروفیسر اے۔ کے سریواستو نے کی۔ انھوں نے کہا کہ قرۃ العین حیدر چیئر قائم کرنے کے لیے اردو والوں کو اپنی کوششیں تیز کردینی چاہیے۔ اس ضمن میں آنے والی مشکلوں کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تمام اسکالروں، ادیبوں، شاعروں اور شرکائے سیمینار نے صدر شعبۂ اردو کو سیمینار کی کامیابی پر مبارک بادیاں دیں۔ شعبے کی لیکچرار محترمہ معزہ قاضی کے شکریے پر سیمینار اختتام کو پہنچا۔ (ڈاک سے)

جاوید نامہ ۔۔۔ اقبال اور عصرِ حاضر کا خرابہ

● حیدرآباد۔ 19 فروری، ''تنہائی اور ناصبوری کے سرچشموں سے ''جاوید نامہ'' کا ظہور ہوا ہے بیسویں صدی کے ابتدائی پچیس برسوں کے دوران دنیا بڑی تیزی کے ساتھ تبدیل ہوئی۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد کا دور ایک اضمحلال کا دور تھا۔ اسی اداسی کی تہہ سے ادب کی دنیا کے دو بڑے واقعے نمودار ہوئے۔ ایک تھی ایلیٹ کی ''ویسٹ لینڈ'' اور دوسری جیمز جوائز کی یولیسیس کی اشاعت۔ اس کے برعکس اقبال اپنے عہد کی کشتِ ویراں (خرابے) سے مایوس نہیں تھے۔ ان کی نظر انسان کے ایک پائیدار اور مستحکم مستقبل پر تھی۔'' ان خیالات کا اظہار پروفیسر شمیم حنفی نے اقبال اکادمی حیدرآباد کے زیرِ اہتمام منعقدہ توسیعی لکچر میں کیا۔ ان کی تقریر کا عنوان تھا ''جاوید نامہ ۔۔۔ اقبال اور عصرِ حاضر کا خرابہ'' جلسے کی صدارت محمد ظہیرالدین صاحب صدر اقبال اکادمی نے فرمائی۔

پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ اقبال کا شعور حالی اور اکبر کے مقابلے میں کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ اقبال وجودی فکر کے سب سے بڑے ترجمان ہیں باطنی پیچ وتاب غالب اور اقبال دونوں کے کلام میں ملتا ہے۔ بالِ جبریل کی ایک چھوٹی سی نظم'' جاوید کے نام'' میں ہمیں جاوید نامے کے اختتامیہ کی جھلک ملتی ہے۔ جاوید نامہ ایک تخلیقی بیانیہ ہے جو کہیں کہیں مولانا روم کی مثنوی کی توسیع معلوم ہوتا ہے۔ دونوں میں رفعت وجلال کی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ اقبال اور رومی دونوں میں زمانے کے فرق کے باوجود مماثلتیں ہیں۔ عقل اور عشق کا موضوع رومی اور اقبال دونوں کے پاس مشترک ہے۔ دونوں جبر کے منکر ہیں۔ جاوید نامہ ہمہ رنگ سفر نامے کی طرح ہے یہ اقبال کے تجربے اور کمال فن کا نچوڑ ہے۔ انا میری شمل نے اسے فکرودانش کا زبردست سرچشمہ قرار دیا ہے۔ اقبال کی فراست اور نگاہ دور بیں کا حوالہ دیتے ہوئے شمیم حنفی نے آج کے دور کی حد سے بڑھی ہوئی آزادی، نسواں کا ذکر کیا۔ اقبال کے کلام میں ابلیس کا تذکرہ بھی ملتا ہے جو جاوید نامے میں بہت تفصیل سے آیا ہے وحدتِ انسانی کا تصور اقبال کے کلام میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ اقبال نے اپنی مہم کا اختتام اس دین کی طرف کیا ہے جسے حضورؐ لے کر آئے تھے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے پروفیسر سید سراج الدین سابق صدر اقبال اکادمی کو زبردست خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کا ترجمہ ہی اس طویل مضمون کا محرک ہوا۔

صدرِ جلسہ محمد ظہیرالدین صاحب نے پروفیسر شمیم حنفی کے مقالے کو ان کی علمی بصیرت اور گہری نظر کا ایک بہترین نمونہ قرار دیا۔ جلسے کا آغاز قرأت کلام پاک سے ہوا۔ سید امتیاز الدین معتمد اقبال اکادمی نے کلام اقبال پیش کیا۔

باذوق سامعین کی کثیر تعداد جلسے میں شریک تھی۔ ضیاء الدین نیر نائب صدر اکادمی نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور شکریہ ادا کیا۔

(ڈاک سے)

ہر صنف کے مطالعے کے وقت اس کے تقاضوں کا خیال رکھنا ضروری

● نئی دہلی۔ 26 فروری، آپ جو کچھ پڑھ رہے ہیں وہ ادب کی کس صنف میں ہے اسے جاننا ضروری ہے۔ ہر صنف کے اپنے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ ان تقاضوں کے مدنظر تخلیقی عنصر سامنے آتا ہے۔ قدیم شعری اصناف کو پڑھتے وقت اس زمانے کے تقاضوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام منعقدہ اپنے توسیعی خطبے میں کیا۔ توسیعی خطبے کا موضوع تھا ''قدیم شعری اصناف قصیدہ مثنوی اور مرثیہ طلبہ کیسے پڑھیں؟'' انھوں نے کہا کہ سرسری تحریر کے بارے میں ہمیں یہ جاننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ اس کی کیا ادبی حیثیت ہے۔ جب ہم پڑھیں تو پہلے یہ جاننے کی کوشش کریں کہ اس کا تعلق کس صنف سے ہے۔ مثنوی کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ بنیادی طور پر یہ جاننا ضروری ہے کہ مثنوی نگار دو طرح کے ہوتے ہیں ایک مثنوی نگار اپنی مثنوی سنانے کے لیے لکھتے ہیں جبکہ دوسرا مثنوی نگار ایسا بھی ہے جو صرف پڑھنے کے لیے لکھتا ہے۔ ایک کے لیے محفل کی اور دوسرے کے لیے بستر کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسری لیٹ کر پڑھی جاتی ہے۔ اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ ہم کس طرح کی مثنوی پڑھ رہے ہیں۔ اگر محفل میں پڑھی جانے والی مثنوی کو تنہائی میں پڑھیں تو بالکل مقصد فوت ہو جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ مرثیہ بھی ادب کی ایک صنف ہے۔ اس صنف کا تقاضہ ہے کہ اس کے اندر رقّت کی کیفیت پائی جائے اگر مرثیے کے اندر رقّت پیدا کرنے اور رلانے کی صلاحیت نہیں ہے تو وہ مرثیہ نہیں ہے۔ اس موقع پر آل انڈیا سرسید میموریل ڈبیٹ میں جامعہ ملیہ طلبہ ٹیم کی دوسری پوزیشن کے لیے صدر شعبہ اردو پروفیسر شمس الحق عثمانی نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور انھیں پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کے ہاتھوں مومنٹو اور توصیفی سند پیش کی گئی۔ پروفیسر شمس الحق عثمانی نے کہا کہ ہمارے لیے یہ فخر کی بات ہے کہ ہمارے عزیز طلبہ نے پوزیشن حاصل کر کے جامعہ کا نام روشن کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں کند ذہنی کا رونا نہیں رونا چاہیے، بلکہ ذہانت کے ساتھ محنت کا پیوند لگانا چاہیے اور یہ کام ہر باشعور کر سکتا ہے۔ اس موقع پر پروفیسر شہناز انجم اور خالد محمود نے بھی اظہار خیال کیا شرکا میں ڈاکٹر عمیر منظر، مطیع اللہ، احمد نفیس کے نام قابل ذکر ہیں۔ پروگرام کا آغاز شاہنواز عالم کی تلاوت سے ہوا۔ جبکہ پروگرام کی نظامت پروفیسر شہناز انجم نے کی۔

(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

اردو مشترکہ تہذیب کی علامت

● نئی دہلی۔ 5 مارچ، شمع ایجوکیشنل اینڈ پولی ٹکنک سوسائٹی (رجسٹرڈ) کے زیر اہتمام ایک شعری نشست بعنوان ''ایک شام امن کے نام'' سے منعقد ہوئی جس میں شمالی مشرقی ضلع کے ڈی سی پی جسپال سنگھ، ایڈیشنل ڈی سی پی پروین رنجن، اے سی پی داتا رام، ایس ایچ او، ایس ڈی دھیا ممبر اسمبلی اور دہلی وقف بورڈ کے چیئرمین چودھری متین احمد، کونسلر محترمہ رضیہ سلطانہ نے شرکت کی۔ اس موقع پر ڈی سی پی جسپال سنگھ نے کہا کہ اردو زبان ہم سب کی وراثت ہے اور ہمیں اس کو سنبھال کر رکھنا ہوگا کیونکہ اردو زبان نے وطن کی آزادی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس طرح کی نشستوں کا انعقاد ہوتے رہنا چاہیے، تاکہ ہماری مشترکہ تہذیب زندہ رہے۔ ایڈیشنل ڈی سی پی پروین رنجن نے کہا کہ شاعری سے میرا قدیمی رشتہ ہے۔ واضح ہو کہ اس شعری نشست کا انعقاد سوسائٹی کے بانی اور صدر مرزا شاہد بیگ چنگیزی کے 44 ویں یوم پیدائش کے موقع پر کیا گیا۔ سوسائٹی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر فہیم بیگ نے کہا کہ علاقے میں پولیس اور عوام کے درمیان بہتر تعلقات قائم ہوں تو علاقے میں شر پسند عناصر کا صفایا ہو جائے۔ اس شعری نشست میں مندرجہ ذیل شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔ راغب نوری، سیف سحری، ناصر سہوانی، شرف نانپاروی، انداز دہلوی، معین شاداب، سریش چندوسوی، صدارت ماسٹر بشیر احمد نے اور نظامت ڈاکٹر ایم آر قاسمی نے انجام دی۔

(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

ناگپور میں کل ہند تعلیمی بیداری کنونشن

● ناگپور۔ مسلم معاشرے میں تعلیمی پسماندگی کا بنیادی سبب انتظامیہ، اساتذہ، سرپرستوں اور قوم کے رہنماؤں کی غفلت اور لاپروائی ہے یہ بات یونائیٹیڈ اسٹوڈینٹس ایسوی ایشن مومن پورہ ناگپور کے زیر اہتمام مولانا ابوالکلام آزادؔ کے پچاسویں یوم وفات کے موقع پر 22 فروری 2008 کو منعقدہ کل ہند تعلیمی بیداری کنونشن کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل نے کہی۔ انھوں نے کہا جو تعلیم وقت کی ضرورت کے مطابق نہ ہو اس تعلیم کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ آج بازار معیشت میں جس تعلیم کی ضرورت ہے جب تک مسلم سماج کے طلبہ اس تعلیم کو حاصل نہیں کریں گے۔ مسلم سماج کی ترقی ناممکن ہے۔ اس کنونشن کی صدارت آل انڈیا علما بورڈ کے صدر مولانا ابوالظفر حسان ندوی ازہری نے فرمائی، مائنارٹیز سیوا مجلس کے قومی صدر الحاج صدیق علی خاں پٹیل کی سرپرستی میں منعقدہ اس اجلاس میں مہمان اعزازی کے

طور پر سلطنت عمان کے قونصل جنرل محترم جمال محمد علی الغیلانی شریک تھے اور جناب ایس کیو زماں (ایم ایل سی)، جناب امیر الدین ملک، جناب حیدر علی دوسانی (ڈائرکٹر ہینڈلوم بورڈ، حکومت ہند) اور جناب محمد داؤد خاں (سکریٹری مسلم چیمبر آف کامرس) بحیثیت مہمان خصوصی موجود تھے۔

قونصل جنرل محترم جمال محمد علی الغیلانی صاحب نے اپنی تقریر میں یونائیٹیڈ اسٹوڈینٹس ایسوسی ایشن کے کاموں کی سراہنا کی، جناب محمد علی پاٹنکر نے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے اجتماعی بیت المال فنڈ قائم کرنے کا مشورہ دیا اور یہ بھی کہا کہ بے جا رسم و رواج سے انحراف کر کے تعلیمی معاملات میں سماج کو زیادہ سے زیادہ دلچسپی لینا چاہیے۔ کنونشن کے صدر مولانا ابوظفر حسان ندوی ازہری صاحب نے مولانا ابوالکلام آزادؔ کی شخصیت اور کردار پر روشنی ڈالی۔ اس اجلاس کی کامیابی کے لیے نائب صدر جمہوریہ ہند محمد حامد انصاری، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی صدر محترمہ سونیا گاندھی اقلیتی امور کے وزیر عبدالرحمٰن انتولے، مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ ولاس راؤ دیشمکھ، عالمی ٹینس اسٹار ثانیہ مرزا، آل انڈیا حج کمیٹی کے چیئرمین اقبال سرحدگی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید، آل انڈیا مسلم ادبی سی آرگنائزیشن کے صدر شبیر انصاری، جل گاؤں اسٹینڈنگ کمیٹی کے چیئرمین عبدالغفار ملک، اقرا ایجوکیشن سوسائٹی جل گاؤں کے صدر عبدالکریم سالار اور ناگپور شہر پولیس کمشنر ڈاکٹر ستیہ پال سنگھ نے اپنے اپنے پیغامات ارسال کیے جنھیں پرنٹ کر کے سامعین میں تقسیم کیا گیا۔

اس موقع پر مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والی شخصیات کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر محمد علی پاٹنکر ممبئی کو "فخر مہاراشٹر ایوارڈ"، ڈاکٹر بانو سرتاج کو "فخر ادب ایوارڈ"، بین الاقوامی باسکٹ بال کھلاڑی سراج احمد انصاری کو "لائف ٹائم اچیومینٹ ایوارڈ"، عبداللہ بھائی میمون کو "مولانا ابوالکلام آزاد تعلیمی ایوارڈ" سید مبین احمد (ای ٹی وی اردو) کو "مولانا ابوالکلام آزاد صحافتی ایوارڈ"، محبوب نور خاں کو "ڈاکٹر ایم اے عزیز نیشنل تعلیمی ایوارڈ" اور بی بی ایجوکیشن سوسائٹی کامٹی کے صدر حسن علی کو "سرسید احمد خاں تعلیمی ایوارڈ" سے نوازا گیا۔

اسی طرح مختلف شعبوں میں اپنی خدمات پیش کرنے والے منتخب حضرات کا استقبال کیا گیا۔ جن میں سردار اٹل بہادر سنگھ، جناب اُپیندر شینڈے، جناب قادر بھائی سپاری والا، جناب فیض فضل محترمہ نیتا پلانڈے، جناب شبیر احمد وردوہی، جناب احمد قادر، مولانا اکبر علی فاروقی، جناب رفیق مجاور، جناب ذاکر خاں بلنذر، مہاراشٹر کرانے جھتیمان طالب علم محبوب الٰہی اور انجینئرنگ کے ہونہار طالب علم ضیاالحسنین کے نام شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ادارۂ ہٰذا کی جانب سے منعقدہ مضمون نویسی کے ریاستی مقابلے میں کامیاب ہونے والے ہائی اسکول اور جونیئر کالج کے طلبہ کو انعامات تقسیم کیے گئے۔ نظامت کے فرائض محمد غلام رسول اشرف اور کلیم احمد نے انجام دیے۔

(ڈاک سے)

جاپان میں اردو

● نئی دہلی۔ 5 مارچ، آج اردو زبان کا جادو برصغیر میں ہی نہیں، بلکہ یورپی ممالک کے دور افتادہ خطوں میں بھی سرچڑھ کر بول رہا ہے، بیرونی ممالک کی مشہور یونیورسٹیوں میں اردو اور ہندی کے شعبے قائم ہیں اور غیر ملکی طلبہ ان زبانوں میں تحقیق و تالیف کا کام، خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ مذکورہ باتیں، اوساکا یونیورسٹی جاپان کے ویزیٹنگ پروفیسر اور عصر حاضر کے مایۂ ناز محقق ڈاکٹر معین الدین عقیلی نے "جاپان میں اردو کی صورت حال" پر لیکچر دیتے ہوئے کہیں۔ مہمان موصوف نے جاپان میں اردو کے وسیع تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ وہاں کی تین مشہور یونیورسٹیوں میں اردو اور ہندی کا شعبہ کامیابی کے ساتھ ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جتنی دل چسپی، خلوص اور لگن کے ساتھ وہاں کے عام باشندوں میں اردو سیکھنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اس کی مثال یورپ کے دوسرے ملکوں میں نہیں ملتی۔ انھوں نے کہا کہ جاپانیوں نے اردو سیکھ کر نہ صرف یہ کہ اردو کے بہترین ادبی شہ پاروں کو، اپنی زبان میں منتقل کر کے ہماری زبان کے روز افزوں ارتقائی سفر کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ بلکہ برصغیر کے روایات اور شاندار تہذیب کے فروغ میں بھی انھوں نے قابل ستائش رول ادا کیا ہے۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر ویر بھدر اور نظامت پروفیسر شاہد حسین نے کی۔ ڈاکٹر خواجہ اکرام نے استقبالیہ کلمات پیش کیے اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اہم شرکا میں ڈاکٹر انور پاشا، ڈاکٹر مظہر مہدی، ڈاکٹر شفیع ایوب، پروفیسر چمن لال، ڈاکٹر گووند پرساد، ڈاکٹر عمر رضا اور ڈاکٹر شیخ آرا شامل ہیں۔ پروگرام کے آغاز میں پروفیسر افغان اللہ خان کے سانحہ ارتحال پر انھیں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ واضح رہے کہ تین روز قبل پروفیسر افغان اللہ خان کا حرکت قلب بند ہو جانے سے دہلی کے لوک نائیک جے پرکاش اسپتال میں انتقال ہو گیا۔

(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

دوحہ میں سہ ماہی "بحث و مباحثہ" کا اجرا

● دوحہ (قطر) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر علی جاوید نے کہا ہے کہ آج جن اقدار کی پاسداری کی ضرورت ہے ہم اس سے بہت

دور نکل آئے ہیں یہی وجہ ہے کہ آج ہم جب پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو ہمیں بہت کچھ کھونے کا احساس ہونے لگتا ہے۔

انجمن محبان اردو ہند قطر کے زیر اہتمام شائع ہونے والے سہ ماہی ''بحث و مباحثہ'' کی عالمی رسم اجرا کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ''بحث و مباحثہ'' ایک خوبصورت کوشش ہے کہ کس طرح بحث و مباحثہ کی دم توڑتی رسم کو زندہ رکھا جاسکتا ہے۔ نائب مدیر (بحث و مباحثہ) عزیز نبیل (جنرل سکریٹری انجمن محبان اردو ہند قطر) نے کہا کہ اس رسالے کے اجرا کا مقصد اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں نئی نسل کے رول کو نمایاں کرنا ہے اور بغیر کسی تعصب کے اردو ادب میں بحث و مباحثہ کے نئے دروازوں کو وا کرنا ہے اس کے علاوہ اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ خلیج عرب کے شعرا و ادبا بطور خاص دوحہ کے شعرا و ادبا کو اس رسالے کے ذریعے بھر پور انداز میں متعارف کرایا جائے۔

ہندوستان سے تشریف لائے مشہور شاعر اور محقق ڈاکٹر شہپر رسول نے رسالے کے مشمولات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ نقش اول اتنا تابناک ہے تو آئندہ آنے والے نقوش انشاء اللہ بہترین ہوں گے۔ انھوں نے کہا کہ دراصل یہ رسالہ نئی نسل کی جانب سے اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے روشن امکانات کی نوید ہے۔

اس موقعے پر صدر مجلس جناب حسن عبدالکریم چوگلے نے اپنی جانب سے ہر طرح کے تعاون کی یقین دہانی کرائی اور رسم اجرا میں رکھی گئی تمام کاپیاں خرید کر حاضرین میں تقسیم کرائیں اور مزید اپنی جانب سے کچھ مالی تعاون بھی رسالہ کے لیے پیش کیا جس کی عوام نے بھر پور تالیوں سے داد دی، انھوں نے کہا کہ آج معاشرے کو اچھی کتابوں اور رسائل کی بے انتہا ضرورت ہے۔

بانی انجمن ابراہیم خاں کمال نے کلمات تشکر ادا کیے اور کہا کہ انجمن محبان اردو قطر کے اغراض و مقاصد میں یہ بات صراحت کے ساتھ واضح ہے کہ اردو کے کسی بھی کاز کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا انجمن کی ترجیح ہوگی۔ قطر میں موجود تمام اہم شعرا و ادبا کے علاوہ ہندوستان سے تشریف لائے مہمان شعرا بھی اس موقع پر موجود تھے۔

باتیں انتظار حسین کی

● نئی دہلی۔ 25 فروری، ہمیں اپنے تخلیقی اور روایتی سرمائے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ یہ سرمایہ ہمارے لیے باعث صد افتخار ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اردو کی داستانوی اور کلاسیکی روایت سے انحراف کے باعث موجودہ افسانوی روایت کو کافی نقصان پہنچا ہے۔ ان خیالات کا اظہار عالمی شہرت یافتہ ادیب، کالم نگار اور ساہتیہ اکادمی کی فیلوشپ سے نوازے گئے انتظار حسین نے ذاکر حسین یادگاری خطبے میں کیا، یہ پروگرام ذاکر حسین مارننگ کالج میں منعقد ہوا۔ انھوں نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ داستانوی روایت کی پھر سے تعمیر نو کی جائے اور جدید چیلنجوں کا سامنا کرنے کے لیے اپنے اندر مزید صلاحیت پیدا کی جائے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ آخر اور انتہا کوئی شے نہیں ہے، چاند اگر ایک حقیقت ہے تو اس کے آگے بھی ایک جہاں موجود ہے جس کی شناخت بے حد ضروری ہے انھوں نے اس بات پر زور دیتے ہوئے کہا کہ افسانوی روایت نے داستانوی روایت کو غیر مہذب، غیر حقیقی اور سطحیت پر مبنی قرار دیتے ہوئے فراموش کر دیا ہے۔ جبکہ بیسویں صدی کے فکشن نے انیسویں صدی کی روایت سے انحراف کرتے ہوئے وہ تمام کھیل کھیلا جو داستانوی روایت میں موجود تھا۔ اس موقع پر شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر خالد علوی، مارننگ و ایوننگ ذاکر حسین کالج کے دونوں پرنسپل ڈاکٹر اسلم پرویز اور ڈاکٹر شاہ عین الحامدین بھی موجود تھے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے صدارتی کلمات میں سامعین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آج نئی نسلیں اپنی تہذیب و تمدن اور داستانوی روایت سے نابلد ہو چکی ہیں اور یہ چیزیں ہمیں بتائی بھی نہیں جاتیں، لہٰذا داستانوی روایت کو از سر نو زندہ کر کے جدید تقاضوں اور حقائق سے انھیں ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے۔

(صحافت، دہلی)

● نئی دہلی۔ 25 فروری، نئے لکھنے والے بہت اچھا لکھ رہے ہیں، حالانکہ شاعری زیادہ ہو رہی ہے۔ جہاں تک معیار کی بات ہے تو کہانی پیچھے نہیں ہے۔ افسانہ نگاری کے فروغ کے لیے کوئی منصوبہ نہیں بنایا جاسکتا یہ تو ایک تخلیقی عمل ہے۔ ہندوستان میں اس وقت بڑے نقاد ہیں اس لیے پاکستان کے مقابلے میں یہاں تنقید اچھی ہو رہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار انتظار حسین نے آج ذاکر حسین کالج میں 20 ویں ذاکر حسین میموریل لیکچر کے بعد روز نامہ راشٹریہ سہارا کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کیا۔ ذاکر حسین یادگاری خطبہ پیش کرتے ہوئے انتظار حسین نے کہا کہ ان کے لیے فخر اور خوشی کی بات ہے کہ انھیں اس درسگاہ میں خطبہ پیش کرنے کا اعزاز حاصل ہو رہا ہے جس کا تعلق ڈاکٹر ذاکر حسین جیسی شخصیت سے ہے۔ انھوں نے ساہتیہ اکادمی کا شکریہ ادا کیا جس کے ذریعے پریم چند فیلوشپ دیے جانے کی وجہ سے انھیں یہاں آنے کا موقع ملا۔ انھوں نے کہا کہ ہم اس وقت بہت بڑے ادبی اور تہذیبی بحران سے دوچار ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا کہ انتظار حسین نے بہت بڑے تہذیبی اور ادبی بحران کی جو بات کہی ہے اس سے میں اتفاق کرتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں اس بات کا جائزہ لینا ہوگا کہ سوسوا سو سال میں ہم نے کیا کھویا اور کیا

پایا۔ ہمارا کل ہم سے کافی دور ہوگیا ہے یہ ہمارے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ ہم نے وقت کا ایک بڑا ذخیرہ گنوادیا۔ آج کے بچے اپنی تہذیب کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھ رہے ہیں۔ اس سمت میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● جے پور۔ 17 فروری، کوپنک سٹی پریس کلب جے پور میں ''ادبی سنگم'' اور ''انجمن ترقی اردو ہند'' جے پور کے زیر اہتمام ''جشن ہوش سرحدی'' کے موقع پر منعقدہ ایک ''کل راجستھان'' سطح کے مشاعرے میں پاکستان سے آئے ہوئے اردو کے ممتاز افسانہ نگار جناب انتظار حسین نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی۔ جناب گردھاری لال بھارگو ایم۔ پی۔ نے اس مشاعرے کی صدارت کی۔ جناب ش۔ک۔ نظام اور ڈاکٹر اجلا اروڑا (سابق وزیر تعلیم راجستھان) مہمانِ اعزازی کے طور پر شریک ہوئے۔ شروع میں جناب دھیر مدر مدان نے صدر، مہمان خصوصی اور مہمانانِ اعزازی کا صافہ پہنا کر استقبال کیا۔ بعدازاں جناب ش۔ک۔ نظام نے، انتظار حسین صاحب کی شخصیت اور افسانہ نگاری کے نمایاں خصائص پر روشنی ڈالتے ہوئے ساہتیہ اکادمی کا شکریہ ادا کیا، جس کی معرفت ادبی طبقہ انتظار حسین جیسی عظیم شخصیت سے مکالمہ قائم کرسکا۔

اس موقع پر انتظار حسین صاحب نے اپنے افسانوں میں منعکس و موجزن، ہند ایرانی مشترکہ تہذیبی روایات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہماری تہذیبی و ثقافتی روایات و اقدار یکساں ہیں اور ہمیں ان سے روشنی حاصل کرنا چاہیے۔ انتظار حسین صاحب نے اس موقع پر ڈی۔ آر۔ مدان ہوش صاحب کے شعری مجموعے ''جدا پرواز''، ''ورق ورق ہوش'' (ہوش پر مضامین) مضطر صدیقی کی ''کلیات'' اور درد ہوشیار پوری کے شعری مجموعے ''سفالہ'' کی رسمِ اجرا بھی انجام دی۔ اس کے بعد شاہد پٹھان نے انتظار حسین کی آمد جے پور پر اپنے منظوم تاثرات کا اظہار کیا۔

آخر میں صدرِ مجلس جناب گردھاری لال بھارگو نے جشن ہوش میں انتظار حسین کی شرکت کو خوش آئند بتاتے ہوئے اسے کامیابی جشن ہوش سے تعبیر کیا۔

اس کے بعد مشاعرہ ہوا، اس میں امان خاں، رضا شیدائی، درد ہوشیار پوری، مضطر صدیقی، عشرت دھولپوری، رفیق ہاشمی، ملکہ نسیم، عزیز ایوبی، ظفر گوالیاری، شاہتاپالی روشن، زینت کیفی، ویربالا بھاڈسار، حاکم لطیفی، ساغر جے پوری، منودیوشرماء منوج متل، تبسم رحمانی، درد اکبرآبادی، عبدالرحیم اختر اور مدان ہوش سرحدی نے اپنا کلام پیش کیا۔ مشاعرے کی نظامت کے فرائض تبسم رحمانی نے انجام دیے۔ (ڈاک سے)

زندگی ہے تو کہانی بھی ہوگی

● نئی دہلی۔ 29 فروری، غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام شام شہر یاراں کے موقع پر ایوان غالب میں آئی سی سی آر کے وائس چیئرمین اور جامعہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے مشہور ادیب و شاعر فیاض رفعت کی علی گڑھ کی یادوں پر مشتمل کتاب ''زندگی ہے تو کہانی بھی ہوگی'' کا اجرا کیا۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں علی گڑھ کے حوالے سے کہا کہ ہمیں ماضی کی یادیں جو یاد نہیں آرہی تھیں اس کتاب کو پڑھ کر یاد آنے لگیں۔ انھوں نے کہا کہ فیاض رفعت نے کتاب کو لکھنے میں سنجیدگی کے ساتھ بہت احتیاط برتی ہے۔ جس کے لیے وہ قطعی نہیں جانے جاتے۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ علی گڑھ کی ایک بہت بڑی روایت ہے اس کی خوبصورتی کو کسی حد میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے کہا کہ مصنف نے اس کتاب کو منظر عام پر لاکر ایک اچھا کام کیا ہے لیکن اس پر مزید کام ہونا چاہیے۔ تاکہ نئی نسل بھی یہاں کی روایات کے ساتھ بہت سی اہم شخصیات کے متعلق جان سکے۔

پروفیسر شمیم حنفی نے کہا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بہت چہرے ہیں، وہاں بہت سے لوگ بستے ہیں لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن میں علی گڑھ بس جاتا ہے۔ فیاض رفعت نے دلچسپ کتاب لکھی ہے جس میں راہ چلتی انسانیت کو تلاش کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مصنف نے اس کتاب میں دوسروں کا جس طرح کھلے ذہن سے ذکر کیا ہے وہ غیر معمولی ہے۔

پروفیسر شمس الحق عثمانی نے کہا کہ آج شہروں کی شناخت ختم ہوچکی ہے مصنف نے اس موضوع کا انتخاب کرکے علی گڑھ کی اہمیت کو واضح کیا ہے، پیغام آفاقی نے کہا کہ بائیوگرافی لکھنا بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے اس موضوع پر بہت کم تحریریں لکھی گئی ہیں۔ مسٹر وجیہہ الدین نے کہا کہ مصنف نے جس سچائی کے ساتھ اس کتاب میں چھوٹے چھوٹے واقعات کو الگ انداز سے پیش کیا ہے وہ دل کو چھولینے والے ہیں ساتھ ہی مسلم یونیورسٹی کو جس انداز میں برباد کیا جارہا ہے اس کی طرف بھی یہ کتاب اشارہ کرتی ہے۔

تقریب میں اے ایم یو کی معمر شخصیت احسان الدین نے جنھوں نے 1942 میں یونیورسٹی سے تعلیم ختم کی اس دور کی تاریخ سے لوگوں کو بڑے دلچسپ انداز میں واقف کرایا۔

کناڈا سے آئی پروین شیر نے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ میرا مائکہ اور سسرال دونوں کا تعلق علی گڑھ سے ہے لیکن افسوس ہے کہ میں اے ایم یو کی طالب علم نہیں رہی۔ انھوں نے کہا کہ جو بھی فن ہمیں ملا ہے اس سے دوسروں

کے آنسو پونچھے جائیں نہ کہ اسے ذریعہ معاش بنایا جائے۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر شاہد ماہلی نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا اور ساتھ ہی مذکورہ کتاب کے مصنف فیاض رفعت کی زندگی پر روشنی ڈالی۔ تقریب کی نظامت رضا حیدر نے کی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

حلقۂ تشنگان ادب کی 400ویں ادبی شام

● نئی دہلی۔ 8مارچ، آج اردو زبان دنیا کی بڑی زبانوں میں سے ایک ہے اور مسلسل ترقی کی جانب گامزن ہے کیونکہ اس کے اندر دوسری زبانوں کے الفاظ کو جذب کرنے کی خوبی ہے۔ ان خیالات کا اظہار مقررین نے راجندر بھون میں اردو اکادمی دہلی اور شکتی بھوگ فوڈس لمیٹڈ کے تعاون سے حلقہ تشنگان ادب کے زیر اہتمام 400ویں ادبی شام کے موقع پر کیا۔ اس موقع پر ''شعروادب میں آسان زبان کی اہمیت'' کے موضوع پر ایک سیمینار بھی منعقد کیا گیا۔ جس میں اردو ادب کی معروف شخصیات نے مقالے پیش کیے۔

پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے شعروادب میں آسان زبان کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ پریم چند آج بھی عوام کے درمیان مقبول اس لیے ہیں کیونکہ انھوں نے عام بول چال کی زبان استعمال کی جبکہ ان کے دور کے بہت سے ادیب آج لائبریریوں کی رونق بڑھا رہے ہیں۔

مہمان خصوصی دیویندر اسر نے کہا کہ زبان آسان اور مشکل نہیں ہوتی بلکہ مانوس وغیر مانوس ہوتی ہے۔ جو زبان ہمیں مشکل لگتی ہے دراصل ہم اس سے غیر مانوس ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ فلمیں زبان کی ترویج وترقی کے لیے وہ کام انجام دے رہی ہیں جو ادب بھی نہیں دے سکا۔ انھوں نے کہا کہ جب تخلیق تکمیل کو پہنچ جاتی ہے تب قاری اسے معنی ومطلب عطا کرتا ہے۔ اس موقع پر پروفیسر صادق نے زبان کے تعلق سے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ دنیا میں اس وقت تقریباً ساڑھے تین ہزار زبانیں بولی جارہی ہیں۔ ان میں سے بڑی تعداد ان زبانوں کی ہے جو یا تو مررہی ہیں یا پھر دوسری بڑی زبانوں میں ضم ہوتی جارہی ہیں۔ اردو زبان آزادی کے بعد سے مسلسل ترقی کررہی ہے اردو بولنے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر یہ کہا جائے کہ رسم الخط کے اعتبار سے اردو مررہی ہے۔ تو اس کا جواب ہے کہ کوئی بھی انسان اپنی کل زندگی میں سے صرف 2فیصدی ہی لکھتا ہوگا جبکہ 98فیصدی بولتا ہی ہے۔ اس اعتبار سے بھی اردو ترقی کررہی ہے۔

ڈاکٹر دھریندر ناتھ نے ''اردو غزل میں آسان زبان کی اہمیت'' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ غزل کا وہ شعر معیاری مانا جائے گا جو دل سے نکلے فوراً دل میں اترے اور بے ساختہ زبان پر چڑھ جائے۔ انھوں نے کہا کہ ہر دور میں زبان کا سفر عوام کی جانب رہا ہے اور اردو کے تعلق سے یہ بات صادق آتی ہے۔ ظفر مرادآبادی نے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ کسی زبان کو کسی مذہب یا نظریے سے وابستہ کرنا مناسب نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ زبان کبھی زوال پذیر نہیں ہوگی جس میں دوسری زبانوں کے الفاظ کو جذب کرنے کی خوبی ہوگی اردو زبان میں دیگر گیارہ زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اس سے قبل اردو اکادمی دہلی کے سکریٹری مرغوب حیدر عابدی نے پروگرام کا باضابطہ افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ عوامی مشاعروں میں آدھے سے زیادہ ایسے لوگوں کی تعداد ہوتی ہے جو اردو نہیں جانتے لیکن کیونکہ وہ اردو بولتے ہیں اس لیے ان کی دلچسپی اردو سے ہے۔ ڈاکٹر جی آر کنول نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

اردو کونسل کے نئے وائس چیئرمین کا خیر مقدم

● نئی دہلی۔ 28فروری، اردو ملک کی مشترکہ تہذیب کی علامت ہے، اردو نے ملک کی یکجہتی وسالمیت کو قائم رکھنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس کی ملک کے کسی بھی خطے میں کوئی مخالفت نہیں ہے، اردو والوں کو اپنے تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اردو کی تعمیر وترقی کے لیے کام کرنا چاہیے۔ ان خیالات کا اظہار آج قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو کے نو نامزد وائس چیئرمین اور اردو کے معروف شاعر وصحافی چندر بھان خیال نے کونسل کے دفتر میں اپنے عہدے کا چارج لینے کے بعد اردو کونسل کی طرف سے منعقد اپنے استقبالیہ جلسے کے دوران کیا۔

چندر بھان خیال نے اس موقع پر مرکزی وزیر برائے انسانی وسائل ارجن سنگھ کا اس بات کے لیے شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے ان پر اعتماد کرکے یہ ذمے داری سونپی۔ انھوں نے کہا کہ ارجن سنگھ کی کوشش ہے کہ اردو کے سیکولر کردار پر آنچ نہ آئے اور اس کی ترویج وترقی میں کسی طرح کی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ انھوں نے کہا کہ ارجن سنگھ نے اردو کی تعمیر وترقی کے لیے برسوں پہلے ایک مہم شروع کی تھی۔ مولانا آزاد اوپن یونیورسٹی اور این سی پی یو ایل اسی کا حصہ ہیں۔ چندر بھان خیال نے کہا کہ اردو واحد ایسی زبان ہے جس کی ملک میں کہیں بھی کوئی مخالفت نہیں ہے۔ اردو ملک کی گنگا جمنی اور مشترکہ تہذیب کی علامت ہے اور اس نے ملک کی یکجہتی وسالمیت کو برقرار رکھنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ اردو کو ملک بھر میں فروغ حاصل ہو۔ چندر بھان خیال نے کہا کہ ہمارا مقصد اور ہمارا مذہب اردو ہے اور اردو والوں کو چاہیے کہ وہ تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اردو کے فروغ اور بقا کے لیے کام کریں۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا کے گروپ ایڈیٹر عزیز برنی نے اپنی تقریر میں کہا کہ اس عہدے پر کسی اردو داں شخصیت کو ہی ہونا چاہیے تھا اس لیے چندر بھان خیال کا انتخاب بہت بہتر ہے۔ اس کے لیے میں ارجن سنگھ جی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ انھوں نے اردو کے کاز کے لیے چندر بھان خیال کی خدمات کی ستائش کی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے چندر بھان خیال کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ وہ نہ صرف ایک اچھے شاعر ہیں بلکہ بہترین صحافی بھی ہیں اور زمینی سطح سے اس مقام تک پہنچے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ این سی پی یو ایل ایک کنبے کی طرح ہے جہاں سب مل جل کر کام کرتے ہیں اور اب خیال صاحب کے آجانے سے ہمیں اور قوت حاصل ہوگی۔ انھوں نے ارجن سنگھ کی اس بات کے لیے تعریف کی کہ وہ جب بھی کوئی پروگرام لے کر ان کے پاس گئے انھوں نے ہمیشہ ان کا حوصلہ بڑھایا ہے۔ انھوں نے اس موقع پر روزنامہ راشٹریہ سہارا کے گروپ ایڈیٹر عزیز برنی کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ اردو صحافت میں ایسی بیباک شخصیت ملنا مشکل ہے جو اصولوں کے لیے پوری جرأت اور بیباکی سے آواز بلند کرتی ہو۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ ان کی قیادت میں سہارا اور اردو صحافت کا کارواں یونہی آگے بڑھتا رہے گا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی بقا کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ اسکولی سطح پر اردو کی تعلیم کا بندوبست کیا جائے کیونکہ جب اسکول میں ہی اردو کی تعلیم نہیں ہوگی تو کالج اور یونیورسٹیوں میں طلبہ کہاں سے آئیں گے۔

معروف شاعر اور صحافی محمود سعیدی نے کہا کہ وہ چندر بھان خیال کو تیس سال سے زیادہ عرصے سے جانتے ہیں۔ وہ ان لوگوں میں ہیں جو اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے پوری محنت اور لگن سے کام کرتے ہیں۔ اردو تہذیب و ثقافت کے ساتھ ان کا گہرا لگاؤ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ بطور شاعر سیرت نبیؐ پر ان کی نظم ''لولاک'' اپنے انداز کی پہلی نظم ہے جس کی ہر جانب سے ستائش ہوئی ہے۔ اس نظم میں انھوں نے رسول اکرمؐ کے وسیلے سے اعلیٰ اسلامی اقدار کو بہترین طریقے سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ خوشی کی بات ہے کہ انھیں کونسل کا وائس چیئرمین بنایا گیا ہے۔ امید ہے کہ ان کی قیادت میں بہتر ماحول میں کام ہوگا۔ معروف شاعر اور دیال سنگھ کالج میں استاد ڈاکٹر مولا بخش نے کہا کہ اس ادارے میں یہ کچھ ٹیک سے ہٹ کر انتخاب ہوا ہے۔ چندر بھان خیال کی ایک شاعر اور صحافی کے طور پر اپنی ایک شناخت ہے۔ ان کی نظم ''ہاں! وے مسلمان ہیں'' ایک بہت اہم نظم ہے اور اس نظم کے خالق کو ہمیں سر آنکھوں پر بٹھانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں اردو کے کاز کے لیے اس بات پر دھیان دینے کی ضرورت ہے کہ کون اردو کا بھلا کرسکتا ہے۔ ہمیں اردو کے ناطے ایک ہونا چاہیے۔ معروف صحافی اور طنز و مزاح نگار نصرت ظہیر نے چندر بھان خیال کو اپنی اور قومی آواز کے عملے کی جانب سے مبارکباد پیش کی اور امید ظاہر کی کہ ان کی قیادت میں این سی پی یو ایل اور زیادہ ترقی کی جانب گامزن ہوگی۔ اس موقع پر اہم شرکا میں این سی پی یو ایل کے پرنسپل پبلیکیشن آفیسر ابوبکر عباد، فاروق ارگلی، ابرار کرتپوری، مشتاق صدف، معصوم مرادآبادی اور شعیب رضا وغیرہ موجود تھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 2 مارچ، آج جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں رفتار ادبی فورم کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے نئے وائس چیئرمین جناب چندر بھان خیال کو استقبالیہ دیا گیا۔ جس میں دہلی کی اہم ادبی شخصیتوں نے شرکت کی۔ جلسے کی صدارت ہندی کے ممتاز دانشور اور ناقد پروفیسر تپن لال نے کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر انور پاشا نے چندر بھان خیال کا استقبال کرتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیئرمین کا عہدہ سنبھالنے پر انھیں مبارک باد پیش کی اور کہا کہ چندر بھان خیال کو جس ادارے کی سربراہی سونپی گئی ہے وہ ادارہ مرکزی حکومت کے ماتحت قائم واحد ایسا ادارہ ہے جسے اردو کے فروغ کے سلسلے میں نوڈل ایجنسی کی حیثیت حاصل ہے اور جس کے دائرۂ کار میں پورا ملک آتا ہے۔ اردو دنیا کو اس بات کی خوشی ہے کہ اس ادارے کے وائس چیئرمین کی حیثیت سے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا گیا ہے جس کا تعلق زمین سے ہے اور جو اردو کے بنیادی مسائل اور زمینی حقائق سے بخوبی واقف ہے۔ انھوں نے کہا کہ خیال صاحب کی سربراہی میں کونسل کارکردگی میں مزید وسعت اور بہتری آئے گی اور اردو کی عوامی بنیاد کو مضبوطی حاصل ہوگی۔ ڈاکٹر مشتاق صدف نے چندر بھان خیال کا تفصیلی تعارف پیش کرتے ہوئے ان کی صحافتی اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالی اور انھیں ایک روشن خیال اور انسانی اقدار کا ضامن فنکار قرار دیا۔ آخر میں چندر بھان خیال نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بے حد انکساری سے اردو دنیا کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اگر ہمیں اردو کے لیے کچھ کرنا ہے تو تمام اردو والوں کو سر جوڑ کر بیٹھنا ہوگا اور مل کر کام کرنا ہوگا۔ اردو اس ملک کی ایک بڑی اور بے حد مضبوط بنیاد رکھنے والی زبان ہے۔ ہمیں اردو سے ہمدردی کا اظہار کرنے کے بجائے اپنی طاقت کو سمیٹ کر اسے اس کا جائز حق دلانے کے لیے آگے بڑھنا ہوگا۔ ہم آپسی لڑائی سے اردو کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ جلسے میں بڑی تعداد میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو، فارسی اور ہندی کے اساتذہ اور طلبہ و طالبات موجود تھے۔

(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

● نوئیڈا۔ 2 مارچ، اردو فاؤنڈیشن نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیئرمین کے عہدے پر مشہور شاعر اور صحافی چندر بھان خیال کی

تقرری پر ایک استقبالیہ پروگرام کا انعقاد کیا اور چندر بھان خیال کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے حکومت ہند کے فیصلے کا خیر مقدم کیا۔ فاؤنڈیشن نے اس توقع کا اظہار کیا کہ وہ اپنے پیشروؤں ڈاکٹر عبدالعلیم، حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، کنور مہندر سنگھ بیدی، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کی عظیم روایت کو آگے بڑھائیں گے۔ ہمارے ملک میں علاقائی اور لسانی تعصب فضا کو مکدر کرتا رہتا ہے۔ اردو ہندوستان کے کونے کونے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اردو کے ادیب وشاعر بلا امتیاز رنگ و مذہب کشمیر سے کنیا کماری تک اور گوہاٹی سے امرتسر تک ہر جگہ اپنی شناخت کے ساتھ موجود ہیں۔ چنانچہ اردو ہندوستان میں علاقائی اور لسانی تعصب کی فضا کو ختم کرنے کے لیے مؤثر رول ادا کرسکتی ہے۔ ضرورت ہے تو صرف اردو کے فروغ اور اردو ادب کے علاوہ بھی ہر مضمون میں معیاری نصابی کتابیں فراہم کرنے کی۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر اخترالواسع نے کی۔ اس موقع پر پروفیسر اخترالواسع نے رفعت سروش اور چندر بھان خیال کی ادبی خدمات کی ستائش کی۔ چندر بھان خیال نے اظہار تشکر کیا اور کہا کہ جس اعتماد کے ساتھ مجھے یہ ذمے داری دی گئی ہے اسے میں خوش اسلوبی سے انجام دینے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 4 مارچ، دہلی اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر شعیب اقبال نے چندر بھان خیال کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا وائس چیئرمین نامزد کرنے پر مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل ارجن سنگھ کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ان کا یہ فیصلہ بہت مناسب ہے۔ انھوں نے کہا کہ ارجن سنگھ صحیح معنی میں مجاہد اردو ہیں۔ انھوں نے کئی اردو ادارے قائم کیے جن سے اردو کی ترویج اور ترقی ہورہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ چندر بھان خیال ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایماندار اور بے باک صحافی بھی ہیں۔ انھوں نے سیرت پاک پر ''لولاک'' جیسی طویل نظم کہہ کر فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی ایک مثال قائم کی ہے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ ادارہ ''رہنمائے تعلیم جدید'' نے اردو کے ممتاز شاعر ادیب اور سرکردہ صحافی چندر بھان خیال کو قومی اردو کونسل کا وائس چیئرمین بننے پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے امید ظاہر کی ہے کہ ان کی سربراہی میں قومی کونسل کی اردو کو فروغ دینے کی کوششوں میں نئی جان پیدا ہوگی۔ اردو سے نابلد خطے سے اردو دنیا میں قدم رکھنے والے چندر بھان خیال نے اردو زبان کی نثری و شعری خدمت کرکے جس طرح اردو کے اس بڑے ادارے میں قدم رکھا ہے وہ اس امر کی دلیل ہے کہ مسٹر خیال اردو سے کتنا گہرا لگاؤ رکھتے ہیں اور اس کی ترقی کے لیے کتنے کوشاں رہتے ہیں۔ (قومی آواز، دہلی)

● نئی دہلی۔ یکم مارچ، یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا کی جانب سے نیو سیلم پور میں واقع صدر دفتر میں جنرل میٹنگ منعقد ہوئی جس کی صدارت تنظیم کے نائب صدر مولانا نسیم مظاہری نے کی۔ میٹنگ میں چندر بھان خیال کو وائس چیئرمین مقرر کیے جانے پر خوشی کا اظہار کیا گیا اور اس کے لیے مرکزی وزارت انسانی وسائل و بہبود کو مبارک پیش کی گئی۔ میٹنگ میں پروفیسر عبدالحق، محمد عارف اقبال، جاوید اختر، حفیظ الرحمٰن خاں، ڈاکٹر سید احمد خاں، سالک دھام پوری، ڈاکٹر بابولال بھرتی، ڈاکٹر سلیم ملک، ڈاکٹر ایم اے حفیظ کاردار، مولانا ایم رضوان اختر قاسمی اور مبعوث احمد وغیرہ نے شرکت کی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 9 مارچ، امن بھائی چارہ کمیٹی کی چیئرپرسن اور جامع مسجد کی سابق کونسلر طلعت سلطانہ نے چندر بھان خیال کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا وائس چیئرمین نامزد کرنے پر مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل ارجن سنگھ کا شکریہ ادا کیا ہے۔ محترمہ طلعت سلطانہ نے چندر بھان خیال کو ایک روشن خیال اور انسانی اقدار کا مل فنکار قرار دیا۔ طلعت سلطانہ نے کہا کہ کم و بیش نصف صدی پر محیط چندر بھان خیال کا ادبی سفر اردو سے ان کے لگاؤ کا جیتا جاگتا ثبوت ہے، ان کی سربراہی میں کونسل کی کارکردگی میں مزید وسعت آئے گی اور اردو کی عوامی بنیادوں کو مضبوطی حاصل ہوگی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

سنیل گنگوپادھیائے ساہتیہ اکادمی کے نئے صدر

● ساہتیہ اکادمی کی نومنتخب جنرل کونسل کے پہلے اجلاس میں صدر کے عہدے کے لیے الیکشن عمل میں آیا جس میں بنگالی کے ممتاز فکشن رائٹر اور شاعر سنیل گنگوپادھیائے نے ملیالم کے ممتاز فکشن رائٹر ایم ٹی واسودیون نائر کو شکست دی۔ جبکہ نائب صدر کے عہدے کے لیے پنجابی کے ممتاز شاعر و ادیب پروفیسر ایس ایس نور بلا مقابلہ منتخب ہوئے۔ اسی اجلاس میں ساہتیہ اکادمی کے ایگزیکیٹو بورڈ کے ممبران کا انتخاب بھی عمل میں آیا جس میں عنبر بہرائچی کو اگلے پانچ برسوں کے لیے اردو مشاورتی بورڈ کا کنوینر بنایا گیا۔

صدر منتخب ہونے کے بعد سنیل گنگوپادھیائے نے نومنتخب جنرل کونسل کی پہلی میٹنگ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں اکادمی کی روایات اور اقدار کو برقرار رکھتے ہوئے تمام زبانوں کے فروغ کے لیے پوری تندہی سے کام کروں گا۔ انھوں نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ساہتیہ اکادمی کو جو نئی جہت دی ہے اسے جاری رکھنے کی کوشش کروں گا۔ اس سے قبل ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری اے کرشنا مورتی نے کہا کہ

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی سرپرستی میں ساہتیہ اکادمی نے کئی بلندیاں حاصل کیں اور انھوں نے اکادمی کو ایک نیا وژن دیا۔ آغاز میں ممتاز ڈرامہ نگار پرسنا نے اکادمی کی سالانہ نمائش کا افتتاح کیا۔ بعد ازاں کمانی آڈیٹوریم میں 24 زبانوں کے انعام یافتہ ادیبوں اور شاعروں کو ایوارڈ سے نوازا گیا جس میں اردو کے انعام یافتہ ادیب و نقاد پروفیسر وہاب اشرفی شامل تھے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

مختصرات

● نجیب آباد۔ 7 مارچ، اتر پردیش اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کی میٹنگ میں اردو کے فروغ کے لیے اردو کی تعلیم پر محنت کرنے اور طلبہ کو اردو پڑھنے کے لیے متوجہ کرنے پر زور دیا گیا۔ ساتھ ہی اردو مضمون میں 60 فیصد نمبر حاصل کرنے والے طلبہ و طالبات کو اعزاز سے سرفراز کرنے، ڈگری کالجوں میں اردو کی تعلیم شروع کرانے کے لیے جدوجہد کرنے کا بھی فیصلہ لیا گیا۔

پرائمری اسکول بھون میں منعقدہ میٹنگ کو خطاب کرتے ہوئے ایسوسی ایشن کے ضلع صدر سعادت حسین نے کہا کہ ہماری ایسوسی ایشن اردو کے فروغ، ترقی اور بقا کے لیے برابر جدوجہد کر رہی ہے۔ ہماری اولین ذمے داری ہے کہ ہم اسکول کالجوں میں اردو طلبہ پر محنت کریں۔ ان کے اندر اردو بولنے، سیکھنے کا جذبہ پیدا کریں۔ انھوں نے کہا کہ اردو ایک شیریں زبان ہے جس کے بغیر کوئی بھی زبان ادھوری ہے۔ انھوں نے اردو اساتذہ سے اپیل کی کہ وہ اردو کے لیے ہر ممکن جدوجہد کریں۔ تاکہ ان نامساعد حالات میں بھی اردو کی ترقی ہو سکے۔

میٹنگ میں اتفاق رائے سے اردو مضمون میں 60 فیصد نمبر حاصل کرنے والے طلبہ کو اعزاز سے سرفراز کیے جانے کا فیصلہ لیا گیا۔ ساتھ ہی ڈگری کالجوں میں اردو مضمون کی تعلیم شروع کرانے کے لیے ایک میمورنڈم دیے جانے کا بھی فیصلہ لیا گیا۔ میٹنگ کے آخر میں اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کے مقامی صدر عابد رشید کو اور مقامی جنرل سکریٹری تنویر احمد کو منتخب کیا گیا۔

مشیر حسین عرفی کی نظامت میں منعقدہ میٹنگ میں ظفر جاوید، محمد طیب، عابد قریشی، بشریٰ، فرزانہ جمال، یٰسین حسن، نثار احمد، ارشد جمالی، محمد یٰسین، محمد عرفان، محمد شفیق، محمد مستقیم، افضال حسین، محمد اکرم انصاری، خورشید احمد، اسما بیگم وغیرہ نے شرکت کی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● رانچی۔ 7 مارچ، انجمن ترقی اردو جھارکھنڈ کے صدر پروفیسر ابوذر عثمانی کی زیر قیادت آج انجمن کے ایک نمائندہ وفد نے گورنر جھارکھنڈ سید سبط رضی سے ملاقات کر کے انھیں 15 نکاتی میمورنڈم سونپا۔ پروفیسر عثمانی نے گورنر سید سبط رضی سے بتایا کہ ریاست جھارکھنڈ میں اردو زبان کو یہاں کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ تو مل چکا ہے لیکن ابھی تک سرکار کی جانب سے اس کے نفاذ سے متعلق کوئی بھی اقدام نہیں ہو رہے ہیں۔ اردو ٹیچر اور نہ ہی اردو ٹرانسلیٹر اب تک بحال کیے گئے ہیں جبکہ اس سے متعلق سرکار کی جانب سے بیانات بار بار آ رہے ہیں، اردو کے ساتھ ایک زیادتی یہ بھی ہو رہی ہے کہ اردو ٹیچروں کی جگہ پر ہندی ٹیچروں کو بحال کر دیا جا رہا ہے۔ انجمن ترقی اردو جھارکھنڈ نے گورنر موصوف سے مودبانہ گزارش کی کہ اگر ریاست میں ٹرینڈ اردو ٹیچر فوراً نہ ملتے ہوں تو اردو جاننے والوں کو ٹیچر کے لیے بحال کیا جائے اور دو تین سال کے اندر ان کو ٹرینڈ کیا جائے۔ انجمن نے اس بات پر بھی اپنی تشویش کا اظہار کیا کہ یہاں اردو کی کتابیں دستیاب نہیں ہیں۔ اسی طرح سرکار کی جانب سے سب کے لیے تعلیم مہم میں بھی اردو کا کہیں کوئی نظم نہیں، میمورنڈم میں یہ بھی ہے کہ جھارکھنڈ اردو اکادمی کی بھی تشکیل کی جائے تاکہ اردو کو مزید فروغ مل سکے۔ مدرسہ بورڈ کو بھی علیحدہ کیا جائے۔ اسی طرح اردو لکچرار اور ریڈر کی خالی سیٹوں کی صحیح رپورٹ ڈیپارٹمنٹ سے لی جائے اور سینٹ میں انجمن ترقی اردو جھارکھنڈ کا نمائندہ مقرر کیا جائے۔ ساتھ ہی رانچی دوردرشن سے کم از کم 5 منٹ کی اردو خبریں نشر کی جائیں کیونکہ اب یہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جا چکا ہے۔ انجمن کی باتوں کو غور سے سننے کے بعد گورنر موصوف نے مناسب اقدام کرنے کی بات کہی اور یقین دلایا کہ میں اردو نیوز سے متعلق رانچی دوردرشن کے ڈائرکٹر سے بات کروں گا۔ گورنر موصوف سے ملنے والوں میں پروفیسر احمد سجاد، ڈاکٹر حسن رضا، مولانا اصغر مصباحی، ڈاکٹر مبارک عباس، غوث ابن رشید، ڈاکٹر زاہد حسین، ڈاکٹر شفیق عالم، قمر الحق اور حسن محمود عثمانی شامل تھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 5 مارچ، ایم سی ڈی اسکول جسولا وار ڈ نمبر 8 میں اردو زبان میں تعلیم کا نظم نہ ہونے سے بچوں کے والدین میں بے چینی پائی جاتی ہے۔ اسکول میں اردو زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال کرنے کے مطالبے کو لے کر اوکھلا کی مقامی سماجی و تعلیمی تنظیم مولانا آزاد ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر آرگنائزیشن کے صدر سید اظہار الحسن نے متعلقہ افسران کو خط لکھ کر اس بات کا مطالبہ کیا ہے کہ جب دستور ہند میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ بنیادی تعلیم کا نظم مادری زبان میں کیا جائے تو آخر سرکاری اسکولوں میں اس کا نظم کیوں نہیں کیا جاتا۔ اساتذہ کی تقرری اور اردو میڈیم میں کورس کی کتابوں کی دستیابی ان اسکولوں میں کیوں نہیں کی جاتی جہاں اردو میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی خاصی تعداد موجود ہے جن کی مادری زبان اردو ہے۔ انھوں نے کہا کہ مادری زبان میں تعلیم دینے سے بچوں میں موجود فطری صلاحیت پوری طرح نکھر کر سامنے آتی ہے جو صرف ان بچوں کے لیے ہی نہیں بلکہ ملک کے

لیے بھی فائدہ مند ثابت ہوگی۔ انھوں نے تعلیمی سال 09-2008 میں اردو زبان میں تعلیم دلانے کے لیے اردو سیکشن کا مطالبہ کیا ہے۔
(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

● گلبرگہ۔ 11 فروری، انجمن ترقی اردو گلبرگہ کے زیر اہتمام 9 فروری 2008 کو بمقام ''خواجہ بندہ نواز ایوانِ اردو'' زیر صدارت جناب ولی احمد (صدر انجمن) جلسۂ تقسیم انعامات منعقد ہوا، جس میں جناب مصطفےٰ حسین چیف جوڈیشیل مجسٹریٹ گلبرگہ، الحاج سید لیاقت حسین معینی، پروفیسر محمد عزیز الدین حسین نے بحیثیت مہمانانِ خصوصی شرکت فرمائی۔ جلسے میں ذیشان خدیجہ عنبرین، ایم ٹی ای ایس پی یو کالج فاروہمن، ضلع ہاسن کی طالبہ کو ریاست کرناٹک میں پی یو سی سال دوم (part I) کے تحت اردو مضمون میں سب سے زیادہ نشانات حاصل کرنے پر انجمن ترقی اردو گلبرگہ کی جانب سے مہمان خصوصی جناب مصطفےٰ حسین کے ہاتھوں گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔ تیسرا مقام حاصل کرنے والی طالبہ فردوس خانم طالبہ ایس۔ کے عبدالحمید پی یو کالج وانگیرہ، کو ڈاکٹر سید لیاقت حسین معینی اور پروفیسر محمد عزیز الدین حسین کے ہاتھوں رقمی انعام اور توصیفی اسناد دی گئیں۔

پروفیسر محمد عزیز الدین حسین نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ محمد بن تغلق نے 1335 میں دہلی سے پایۂ تخت دولت آباد منتقل کیا، جس کے بعد جنوبی ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ اور اردو کی ترقی کے لیے حالات سازگار ہوتے گئے پھر 1857 کے بعد علم و ادب کے میدان میں ایک تغیر آیا۔ علی گڑھ تحریک کے نتیجے میں ایک نئی روایت کی بنیاد پڑی اور اردو کو فروغ حاصل ہوتا چلا گیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو صرف شعر و شاعری کی زبان نہیں ہے بلکہ اردو فروغ کی زبان بھی ہے۔

ڈاکٹر سید لیاقت حسین معینی نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہندوستان میں سلسلۂ چشت سے تعلق رکھنے والے دو اولیائے اکرام حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کا فیضان آج بھی جاری ہے۔ گلبرگہ شہر میں جو تعلیمی سرگرمیاں بامِ عروج پر ہیں اس میں سید شاہ محمد محمد الحسینی صاحب قبلہ مرحوم سابق سجادہ نشین بارگاہ بندہ نواز کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ نے 105 تصانیف لکھ کر دکنی زبان کے ذریعے اردو زبان کا جو بیج بویا تھا گلبرگہ میں ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا ہے جس سے تمام علوم کی شاخوں کو سرفرازی حاصل ہورہی ہے۔ جناب مصطفےٰ حسین نے انجمن ترقی گلبرگہ کی سرگرمیوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ وہ اردو سے دور ہوتے گئے کہ دورِ حاضر میں بالخصوص سرکاری مدارس سے اردو طلبہ کا ڈراپ آؤٹ ہمارے لیے باعثِ تشویش ہے۔ انھوں نے انجمن سے خواہش کی کہ وہ اس طرف توجہ دے کیونکہ کسی زندہ زبان کی شناخت اس کے معیاری مدارس ہوتے ہیں اور آج بھی ہمارے درمیان ایسے مدارس موجود ہیں جن سے اردو کے تابناک مستقبل کی امید کی جاسکتی ہے۔

جناب ولی احمد (صدر انجمن) نے اپنی تقریر میں کہا کہ انجمن ترقی اردو گلبرگہ ایک عرصے سے اردو زبان کی ترقی و ترویج کے علاوہ اردو ذریعۂ تعلیم کے ذریعہ طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لیے مسلسل کوشاں ہے۔ انھوں نے انعام یافتگان کو مبارک باد دیتے ہوئے یہی لگن اور محنت سے حصول علم کی تلقین کی۔ انھوں نے انجمن کے قائم کردہ ''تعلیمی فنڈ'' کی افادیت اور اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ وہ اس کے استعمال کے ذریعے اردو زبان کی ترقی و ترویج کے کئی کام کرسکتے ہیں۔

جلسے کا آغاز مولانا عبدالرشید کامل کی قرأت کلام پاک سے ہوا۔ نائب صدر انجمن پروفیسر حمید سہروردی نے مہمانانِ خصوصی کا تعارف پیش کیا۔ نائب صدر انجمن جناب امجد جاوید نے انجمن ترقی اردو گلبرگہ کی سرگرمیوں سے متعلق رپورٹ پیش کی۔ جناب خواجہ پاشاہ انعامدار (معتمد انجمن) نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ میر شاہ نواز شاہین کے شکریے پر جلسہ اختتام کو پہنچا۔ محبانِ اردو کی کثیر تعداد اس جلسے میں شریک رہی۔ (ڈاک سے)

● 25 فروری کو پہلی بار سرونج میں مولا علی صاحب کے پہاڑ پر شاندار آل انڈیا مشاعرہ، لندن سے تشریف لائے ہوئے مشہور شاعر مشتاق سنگھ کے اعزاز میں منعقد کیا گیا، جس میں سہ ماہی انتساب کے گوشۂ مخمور سعیدی اور محمد توفیق خاں کی مرتب کردہ کتاب ''سیفی سرونجی کے نام مشاہیر کے خطوط'' کا اجرا بھی کیا گیا، سد بھاؤ نا منچ کے صدر اتل اگروال، ڈاکٹر سیفی سرونجی اور محمد متین ندوی نے پھولوں اور ہاروں سے مہمان شعرا کا استقبال کیا۔ پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے پروفیسر مختار شمیم نے سد بھاؤ نا منچ کے صدر اتل اگروال کو مبارکباد دیتے ہوئے مہمان شاعروں مخمور سعیدی اور مشتاق سنگھ کی شعری اور ادبی خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ اس کے بعد ''انتساب'' کے تازہ شمارے ''سیفی سرونجی کے نام مشاہیر کے خطوط'' کا اجرا پروفیسر آفاق احمد اور مخمور سعیدی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ ''انتساب'' کے اس شمارے میں گوشۂ مخمور سعیدی شامل ہے۔ پروفیسر آفاق احمد نے سیفی سرونجی کی ادبی خدمات اور ''انتساب'' کی عالمی شہرت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس کتاب میں جن مشاہیر کے خطوط کو جمع کیا گیا ہے، انھیں پڑھ کر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے، کہ آج سرونج کو عالمی نقشے پر ابھارنے والا سیفی سرونجی اور ان کا رسالہ ''انتساب'' ہے۔

مخمور سعیدی نے ''انتساب'' کے ابتدائی دور سے لے کر اس کے پچیس سالہ ارتقا پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے سیفی سرونجی اور اہل اگروال کو مبارکباد دی، اس پروگرام کے بعد مشاعرے کا دور شروع کیا گیا، جس کی صدارت پروفیسر آفاق احمد نے کی اور نظامت کے فرائض عبدالحفیظ عارف نے انجام دیے۔ اس آل انڈیا مشاعرے میں مخمور سعیدی، پروفیسر آفاق احمد، مشتاق سنگھ، ظفر نفیس تقی، سیفی سرونجی، سلیمان آزر نے اپنا کلام سنایا۔ ڈاکٹر شان فخری نے مخمور سعیدی صاحب کی شان میں ایک نظم سنائی مشاعرے کی کامیابی پر مشتاق سنگھ، پروفیسر آفاق احمد اور مخمور سعیدی نے سدبھاؤنا منچ کے صدر اہل اگروال کو اس تاریخی جگہ پر کامیاب مشاعرہ کرنے پر بہت بہت مبارکباد دی۔

(ڈاک سے)

مشاعرے

● ''انجمن محبان اردو ہند قطر'' کی جانب سے گزشتہ دنوں دوسرا مشاعرہ بسلسلۂ جشنِ یوم جمہوریۂ ہند کا انعقاد قطر چیریٹی (عبداللہ الدباغ ہال) میں عمل میں آیا۔ مشاعرے کی صدارت ڈاکٹر علی جاوید (ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت انسانی وسائل حکومت ہند) نے کی، جبکہ ہندوستانی سفارت خانہ برائے قطر کے چارج ڈی افیئر ہریش چندر اروڑا نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت فرمائی۔ مشاعرے میں جن شعرا نے ہندوستان کی نمائندگی کی ان میں راحت اندوری، شاعر جمالی، نواز دیوبندی، عظیم عباس، ڈاکٹر شہپر رسول، طاہر فراز، مزاحیہ شاعر سکندر حیات گڑبڑ شامل تھے۔ مشاعرے کی نظامت کے فرائض انجمن محبانِ اردو ہند قطر کے نائب صدر جناب ندیم ماہر نے انجام دیے۔ اس موقعے پر ایک یادگار مجلّہ بسلسلۂ یوم جمہوریۂ ہند کی رونمائی بدستِ صدرِ مشاعرہ و مہمانِ خصوصی و سرپرستِ اعلیٰ جناب حسن چوگلے و کوآرڈینٹر کل ہند مشاعرہ عظیم عباس دبئی انجمن ابراہیم خاں کمال و صدرِ انجمن خالد داد خاں و مرتب مجلّہ ندیم ماہر (نائب صدر انجمن) عمل میں آئی۔ عزیز نبیل (جنرل سکریٹری انجمن محبانِ اردو ہند قطر) نے اپنے افتتاحیہ کلمات میں انجمن کے قیام کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو ادب و تہذیب ہمارا قیمتی اثاثہ ہے ہمیں اس کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشاں رہنا چاہیے۔ اردو کے مستقبل کے لیے جو کچھ ہم کرسکتے ہیں وہ کریں۔ بانی انجمن ابراہیم خاں کمال نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ آج کا یہ مشاعرہ یادگار ثابت ہوگا اور ہمیں یقین ہے کہ انجمن محبانِ اردو ہند کی کارکردگی میں یہ ایک ایسا خوبصورت اضافہ ہوگا جس کی حلاوت تادیر محسوس کی جائے گی۔ خطبۂ استقبالیہ میں انجمن کے صدر جناب خالد داد خاں صاحب نے صدر مشاعرہ و مہمان خصوصی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انجمن کے قیام اور دوحہ قطر میں چل رہی ادبی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی اور سفارت خانۂ ہند قطر کی اردو کے تئیں محبت اور سرپرستی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ انجمن محبانِ اردو ہند کا سفارت خانہ سے الحاق اس بات کا بین ثبوت ہے کہ یہ انجمن خالص ہندوستانی شناخت رکھتی ہے یہی ہماری کوشش رہے گی کہ اس کی یہ شناخت برقرار رہے۔ دوحہ قطر میں رہتے ہوئے ہندوستان میں شعرائے کرام سے رابطہ اور تمام امور کی انجام دہی ایک دشوار کن مرحلہ ہے، لیکن بحیثیت معاون خصوصی جناب آصف اعظمی کی شخصیت ہمارے لیے ایک من جانب اللہ انعام ہے ان کا شکریہ ادا نہ کیا جائے تو یہ کسی بھی اعتبار سے صحیح نہ ہوگا کیونکہ ان ہی کی بدولت تمام کام بآسانی مکمل ہوئے۔

مہمان خصوصی جناب ہریش چندر اروڑہ (چارج ڈی افیئر سفارت خانۂ ہند قطر) نے کہا کہ اس پروگرام میں آکر انھیں بے انتہا خوشی ہورہی ہے کہ آج دوحہ قطر کو ان ہندوستان سے تشریف لائے ہوئے شعرا کی ضیافت کا موقعہ فراہم ہوا، اس کا سہرا انجمن محبانِ اردو ہند کے سبھی عہدیداران اور سرپرستان، خاص طور پر ہر دل عزیز شخصیت جناب حسن عبدالکریم چوگلے اور جناب عظیم عباس کے سر جاتا ہے۔

صدرِ مشاعرہ ڈاکٹر علی جاوید نے اس خوبصورت مشاعرے کے انعقاد پر انجمن کے اراکین کو مبارکباد پیش کی، اور دوحہ قطر میں اردو شاعری کے معیار کو سراہا۔ نیز اردو زبان کی خدمات اور تاریخی رول پر روشنی ڈالی اور کہا کہ آزادی کی لڑائی میں اس زبان نے جو کردار ادا کیا ہے وہ لاثانی ہے جس کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ (ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

● نئی دہلی۔ 24 فروری، مرزا غالب کے 139 ویں یوم وفات اور غالب اکادمی کے 39 ویں یوم تاسیس کے موقع پر غالب اکادمی کے آڈیٹوریم میں طرحی مشاعرہ کا انعقاد ہوا۔ صدارت افغانستان ایمبیسی کے کلچرل کونسلر محمد انسر راہمین نے اور نظامت اعجاز انصاری نے کی۔ اس مشاعرہ کے مصرع ہائے طرح:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں
پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

مندرجہ ذیل شعرا نے اپنی طرحی غزلیں سنا کر سامعین کو محظوظ کیا:

محمد انسر راہمین، رفعت سروش، وقار مانوری، متین امروہوی، ابرار کرت

پوری، کمال جعفری، ایم قمر الدین، اسد رضا، تابش مہدی، شکیل شمسی، فرحت احساس، نعمان شوق، شہباز ندیم ضیائی، ڈاکٹر احمد محفوظ، ڈاکٹر احمد علی برق اعظمی، ممتا کرن، ڈاکٹر روبینہ شبنم، ڈاکٹر فریاد آزر، اعجاز انصاری، سید راشد حامدی، فاروق ارگلی، خالد شرر اعظمی، نسیم عباسی، ڈاکٹر عقیل احمد (سکریٹری غالب اکادمی) نے تمام مہمانوں کا تعارف و استقبال کیا اور اخیر میں تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 25 فروری، کلچرل کونسل دہلی یونیورسٹی کی جانب سے ایک مشاعرے کا انعقاد فیکلٹی آف آرٹس کے کنووکیشن ہال میں کیا گیا جس کی صدارت ممتاز ادیب و شاعر ندا فاضلی نے کی۔ یونیورسٹی کے رجسٹرار ڈاکٹر اے کے دوبے تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ ڈاکٹر اے کے دوبے نے اپنی تقریر میں ادب کی تہذیبی اور سماجی معنویت کو اجاگر کیا۔ کلچرل کونسل کی سکریٹری چترا گپتا نے اردو زبان کے حسن اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے پروگرام کی غرض وغایت بیان کی۔ مشاعرہ کنوینر ڈاکٹر خالد اشرف نے مشاعروں کی تاریخ اور ارتقا پر تفصیل سے اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے مہمانوں اور شعرا کا خیر مقدم کیا۔ اس موقع پر ڈین اسٹوڈنٹ ویلفیئر پروفیسر وج بھی موجود تھے۔ مشاعرے کی نظامت معین شاداب نے کی۔ مشاعرے میں درج شعرا نے کلام پڑھا: ندا فاضلی، اسلم الہ آبادی، ڈاکٹر ایم آر قاسمی علیگ، عفت زریں، راغب نوری ٹکرالوی، حسن کاظمی، اقبال اشہر، معین شاداب، عرفان احمد، کلدیپ سلِل گڑبڑ سہسوانی، منور سرحدی صدف برنی، نیز یونیورسٹی کے بعض طلبہ وطالبات نے اپنا کلام پیش کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 7 مارچ، آل انڈیا رفاہ عام فاؤنڈیشن دہلی (رجسٹرڈ) کے زیر اہتمام گزشتہ شب اردو کے ممتاز شاعر تنویر وصفی (اے ڈی جے، نوئیڈا) کے اعزاز میں عمران عظیم ایڈووکیٹ کے مکان میں شعری نشست منعقد ہوئی۔ نشست کی نظامت ملک زادہ جاوید نے کی۔ کنوینر محمد فیضان جامعی تھے۔ کنوینر محمد فیضان جامعی اور عمران عظیم نے مہمان خصوصی تنویر وصفی کو اعزاز برائے شاعری اور مومنٹو بھی پیش کیا۔ نشست میں درج ذیل شعرا شریک تھے: فرحت احساس، تنویر وصفی، شہباز ندیم ضیائی، شمس رمزی، ملک زادہ جاوید، معین شاداب، عمران عظیم، رؤف رضا، فصیح چودھری، اظہار ندیم، قاری محمد فیضان جامعی، انداز دہلوی، ڈاکٹر راحت مظاہری، حبیب سیفی، ایس یوظفر، علی اکرم نور پوری، فیاض قادری، ساحر داؤدنگری، شاذ رمزی، ثمر نور پوری۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● رام پور۔ 24 فروری، دبستان رام پور کے ادبی ماحول کو سرگرم کرنے کی غرض سے دانشوران رام پور نے ادبی نشستوں کا جو سلسلہ شروع کیا ہے، اسی سلسلے کی ایک شعری نشست مشہور سماجی شخصیت مکرم حسین صدیقی کے مکان واقع زینہ عنایت خاں پر منعقد کی گئی۔ روایتی انداز میں مشاعرے کا آغاز شمع روشن کر کے کیا گیا۔ انجمن الفلاح کے بانی انور مسعود خاں نے شمع روشن کی۔ نشست کی صدارت بزرگ شاعر سید قاسم رامپوری نے کی، جبکہ نظامت کے فرائض عرفان دانش نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ شعری نشست کی ابتدا کرتے ہوئے محمد علی خاں نشتر نے حمد باری تعالیٰ پیش کی اور ڈاکٹر جاوید نسیمی و حسین افسر سنبھلی نے ہدیۂ نعت وسلام پیش کیا۔ اس کے بعد جن شعرا نے اپنے کلام بلاغت نظام سے سامعین کو نوازا، ان کے اسمائے گرامی ہیں: قاسم رامپوری، افسر سنبھلی، جاوید نسیمی، شاہد محمود خاں، عرفان دانش، ثاقب رامپوری، ڈاکٹر فرید صدیقی، تصور رامپوری، فرید نعمانی، نشتر رامپوری، عدنان ضیائی۔ دیر رات تک چلنے والی اس نشست میں کئی شعرا کو بار بار زحمت سخن دی گئی اور سامعین نے یہ امید ظاہر کی کہ ماہانہ نشستوں کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا۔

(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)

● ٹانڈہ۔ 2 مارچ، (صلاح الدین) قصبے میں گزشتہ شب انجمن محراب ادب کے زیر اہتمام ایک ادبی نشست کا انعقاد ٹانڈہ کے مقامی شاعر سعید دانش کی رہائش گاہ پر کیا گیا۔ اس شعری نشست کی صدارت بزرگ شاعر جناب مظہر عمران نے فرمائی جبکہ نظامت کے فرائض کسن ٹانڈوی نے انجام دیے۔ اس ادبی نشست میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب شاداب علی ایڈوکیٹ الہ آباد ہائی کورٹ و دینک جاگرن کے نمائندہ خلیق خاور بھی موجود تھے۔ درج ذیل شعرا کے کلام کو سامعین نے بہت پسند کیا: احمد ٹانڈوی، محمد رفیق ہیکل، اصغر علی اصغر، محمد شفیع قمر، کسن ٹانڈوی، شہاب ٹانڈوی، منصف علی منصف، سہیل ٹانڈوی، سعید دانش، عتیق احمد، مظہر عمران اور سلیم احمد سلیم۔ شعری نشست رات 9 بجے شروع ہو کر رات 2 بجے بحسن وخوبی انجام پذیر ہوئی۔

(صحافت، دہلی)

وفیات

پروفیسر افغان اللہ خاں

● نئی دہلی۔ یکم مارچ، آج یہاں شام ساڑھے چھ بجے کے قریب اردو کے معروف استاد اور مصنف پروفیسر افغان اللہ خاں کا حرکت قلب بند ہوجانے سے اچانک انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم گورکھپور

یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف پروفیسر افغان اللہ خاں نے فراق گورکھپوری پر گراں قدر تحقیقی کام کیا۔ وہ فراق کے شاگرد بھی تھے۔ مرحوم یہاں دہلی اردو اکادمی کے سیمینار میں شرکت کے لیے آئے تھے اور سیمینار میں انھیں کل اپنا مقالہ پیش کرنا تھا۔ آج شام وہ سیمینار میں شرکت کر کے نکل رہے تھے کہ ان پر دل کا شدید دورہ پڑا۔ انھیں فی الفور ایل این جی پی اسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے انھیں مردہ قرار دے دیا۔

پروفیسر افغان اللہ خاں کا شمار ان اساتذہ میں نہیں تھا جو صرف مطالعہ گاہ تک محدود ہوتے ہیں بلکہ وہ ایسے ادیب اور ایسے مشفق استاد تھے جو نئی نسل میں لکھنے اور پڑھنے کا ذوق پیدا کر دیتے ہیں۔ انھوں نے بہت تیزی کے ساتھ ادبی حلقے میں اپنی حیثیت اور اپنی شناخت پیدا کر لی تھی۔ وہ ان دنوں شمال مشرقی یوپی میں تحریک آزادی کی تاریخ پر کام کرنے میں مصروف تھے وہ اردو کے حوالے سے ہونے والے ہر پروگرام کے روح رواں ہوا کرتے تھے۔ اردو کارواں اور اردو بڑھاؤ تحریک کے بھی وہ ایک فعال رکن تھے۔ ان کی نصف درجن تصنیفات اور درجنوں مقالے ہندوستان اور پاکستان کے مؤقر رسالوں میں شامل اشاعت ہو چکے ہیں وہ شعر بھی کہتے تھے: ان کے بعض اشعار لوگوں کی زبان پر تھے مثلاً:

بند کرنا تھا کتابوں کا کہ آنکھیں کھل گئیں
زندگی جب سامنے آئی تو صورت اور تھی
سامنے آتے ہوئے نیزے کا بڑھ کر چومنا
پیٹھ میں چبھتے ہوئے خنجر کی لذت اور تھی

مرحوم کا شعری سرمایہ بھی کافی ہے اور وہ اسے ترتیب دینے میں لگے ہوئے تھے کہ سفر آخرت کے لیے ان کا بلاوا آ گیا۔

زبیر شفائی

● کانپور۔ 28 فروری، جدید غزل کے معروف شاعر زبیر شفائی آج صبح 9 بجے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ زبیر شفائی ایک طویل عرصے سے بیمار تھے اور مختلف عوارض میں مبتلا تھے علاج برابر جاری تھا لیکن مشیت ایزدی کو آخر یہی منظور تھا۔ آخری لمحوں میں ان کے تمام اہل خانہ ان کے پاس موجود تھے۔ مرحوم کے پسماندگان میں اہلیہ دو بیٹے دو بیٹیاں ہیں ان کے علاوہ پوتوں اور نواسوں سمیت ایک بھرا پرا خاندان ہے زبیر شفائی کی عمر 84 برس تھی۔ وہ بین الاقوامی شہرت کے حامل اور نئی غزل کے منفرد لہجے کے شاعر تھے۔ کانپور میں ان کے بعد یہ جگہ خالی رہے گی نصف صدی تک انھوں نے اردو غزل کی خدمت کی مرحوم زبیر شفائی کو بعد نماز مغرب ان کی قیام گاہ سے کچھ ہی فاصلے پر جوہی خرد واقع قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ ان کی نماز جنازہ میں کانپور کے ہر شعبے کے افراد موجود تھے۔

لئیق اختر فیض آبادی

● فیض آباد۔ 4 فروری، اردو کے بزرگ صحافی اور معروف طنز و مزاح نگار لئیق اختر فیض آبادی کا گذشتہ روز اسّی برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ ان کے بیٹے سید منظر مہدی کی اطلاع کے مطابق مرحوم کئی ماہ سے علیل تھے لیکن اس عالم میں بھی وہ لکھنے پڑھنے میں مشغول رہتے تھے۔ گذشتہ بیس سال سے انھیں دل کا عارضہ لاحق تھا۔ صحت ادھر بے انتہا گر گئی تھی۔ ''قومی آواز'' میں ''گلوریاں''، ''صحافت'' میں ''بے تکلف''، ''اپنا اخبار'' میں ''گلفشانیاں''، ''آپ کی طاقت'' میں ''گدگدی''، ''جدید مرکز'' میں ''چٹکیاں''، اور ''اودھ نامہ'' میں ''مزاحیہ کالم'' لکھنے والے لئیق اختر فیض آبادی کی تدفین دوشنبے کو بعد نماز ظہر ان کے آبائی قبرستان واقع مولوی باغ وزیر گنج میں ہوئی۔

گربچن سنگھ

● تاخیر سے موصولہ اطلاع کے مطابق افسانہ نگار گربچن سنگھ 4 جون 2007 کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کی عمر 84 برس تھی۔ دو افسانوی مجموعے ''بھوکا سورج'' اور ''ببلو کے پاپا'' اور ایک ناول ''بن پاکھی'' شائع ہوا۔ ان کی تخلیقات ہندی میں بھی تواتر سے شائع ہوتی تھیں۔ گربچن سنگھ آخری عمر تک افسانے لکھتے رہے۔ اردو میں غالباً ان کا آخری مطبوعہ افسانہ ''چمنی کا دھواں'' ہے جو ''آجکل'' مارچ 2007 میں شائع ہوا تھا۔

راجیندر بہادر موج

● ایک اور اطلاع کے مطابق مشہور شاعر جناب راجیندر بہادر موج 26 دسمبر 2007 کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ موج صاحب پیشے سے وکیل تھے تاہم اردو شعر و ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ ان کا کلام رسائل میں برابر شائع ہوتا رہا ہے۔ ''موج و ساحل'' اور ''موج در موج'' سمیت ان کے آٹھ شعری مجموعے شائع ہوئے۔

□□□

انشاء پبلی کیشنز کی مطبوعات

1. سیریا میں دس روز: رنگین باتصویر سفرنامۂ شام — ف.س.اعجاز -/250 روپے
2. منعکس: انگریزی سے ترجمہ کردہ نظمیں — ف.س.اعجاز -/160 روپے
3. اونچے مکانوں کے قریب: غزلیات — ف.س.اعجاز -/160 روپے
4. ایک شہد کا جیون: افسانے — نعیمہ ضیاء الدین (جرمنی) -/160 روپے
5. پار پرے: انڈمان، کالا پانی کے پس منظر میں ناول — جوگندر پال -/150 روپے
6. دھواں: افسانے (ساہتیہ اکاڈمی انعام یافتہ) — گلزار -/160 روپے
7. ایکادخیال: افسانے — انور شیخ -/160 روپے
8. موقف: تنقیدی مضامین — ف.س.اعجاز -/250 روپے
9. ساوتری گوسوامی کے افسانے — ساوتری گوسوامی -/160 روپے
10. موسم بدل رہا ہے: غزلیات، ہندی — ف.س.اعجاز -/100 روپے
11. خوابوں کے اسرار: نیند اور خوابوں سے متعلق نفسیاتی مضامین — ف.س.اعجاز -/200 روپے
12. ازدواجی شکوہ: شادی شدہ زندگی سے متعلق اقوال نظم ونثر — ف.س.اعجاز -/60 روپے
13. ارضِ مقدس میں چند روز: سفرنامہ — اے امیر النساء -/100 روپے

دیگر مطبوعات کے لیے انکوائری کریں۔

کُل قیمت پیشگی بذریعہ بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر روانہ کریں۔

عالمی ادب کا شاہکار نظموں کی نئی کائنات

مُنعکِس

انگریزی سے ترجمہ کردہ نظمیں: ف.س.اعجاز

انشاء پبلیکیشنز

Insha Publications

25-B, Zakaria Street, Kolkata - 700073

Phone : (033) 22354616

e-mail : inshapublications@yahoo.co.in

خاص اور عام اشاعتوں کے لیے مقبول

ماہنامہ **انشاء**

دنیا کا مقامی اردو رسالہ

مدیر: ف.س.اعجاز

قیمت اندرون ملک: -/20 روپے

سالانہ: -/120 روپے

(سال میں چھ شمارے)

منی آرڈر یا بنک ڈرافٹ بنام Insha Publications روانہ کریں۔

چیک کلیرنگ فیس -/60 روپے زائد

بیرون ملک: 25/امریکی ڈالر

یا

15 برطانوی پونڈ

<u>ابتک 17 خاص نمبر شائع ہو چکے ہیں۔</u>

درج ذیل خاص شمارے دستیاب ہیں:

1. گلزار نمبر -/300 روپے
2. گوپی چند نارنگ نمبر -/300 روپے
3. اسکنڈے نیویائی ادب نمبر (ایک کولمبس شمارہ۔ براعظم اسکنڈے نیویا کا اردو ادب اور وہاں کا مقامی ادب) -/300 روپے
4. انشاء عالمی اردو افسانے -/250 روپے
5. نیاز فتحپوری نمبر -/250 روپے
6. دلیپ سنگھ نمبر -/50 روپے

آئندہ خصوصی شمارہ

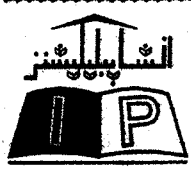

رومی نمبر

اشاعت متوقع: جون 2008

تبصرہ وتعارف

● **تاریخ تمدن ہند**

مصنف: محمد مجیب

صفحات: 279، قیمت: 72 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی-66

مبصر: پروفیسر ظفر احمد نظامی، 164، ذاکر باغ، اوکھلا، نئی دہلی-110025

پیش نظر کتاب تمہید کے علاوہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب تمدن کے آغاز کا احاطہ کرتا ہے، دوسرے باب میں آریوں کے تمدن سے بحث کی گئی ہے، تیسرا باب بدھ مت سے متعلق ہے جبکہ چوتھے باب میں موریا عہد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پانچواں باب ہندوستان، ایران اور یونان کے تمدن کو محیط ہے، چھٹے باب میں گپت عہد کی خصوصیات کا ذکر ہے، ساتواں باب ہیون سانگ اور البیرونی کے لیے وقف ہے اور آٹھواں باب دکن اور جنوبی ہند سے بحث کرتا ہے۔

اس کتاب کے مصنف جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر پروفیسر محمد مجیب کے قلم کا نتیجہ ہے جو موجودہ دور کے ممتاز اور نامور تاریخ داں تھے۔ اپنی تمہید میں انھوں نے تہذیب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ ''ہم کسی ملک کی تاریخ پر حاوی نہیں ہوسکتے جب تک کہ ہم اس کی سیاست کے ساتھ اس کی تہذیب کا مطالعہ نہ کریں۔ تہذیب اور تمدن کے معنی ہیں انسان کا اپنے ذہن اور اخلاقی قوتوں کو تربیت دینا اور انھیں کام میں لانا۔ تہذیب کے کام بننے رہتے ہیں تو جماعت کو تقویت پہنچتی ہے اور اس کی قوت بڑھتی ہے۔ جماعت کو اپنے منصوبوں کو پورا کرنے کا موقع ملتا ہے تو تہذیب پروان چڑھتی ہے۔'' مجیب صاحب نے لکھا ہے کہ گھروں میں ان افراد کی پرورش ہوتی ہے جو تہذیب کی داغلی قدروں کے حامل ہوتے ہیں۔ رسم و رواج گھروں میں برتے جاتے ہیں اس لیے خانگی زندگی کو قومی تہذیب کی نبض قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔'' ان کے بقول تہذیب کی تاریخ کو سمجھنے کے لیے بہت ضروری ہے کہ ہم فنون لطیفہ کی نوعیت اور حیثیت سے اچھی طرح واقف ہوں اور ممکن ہو تو ایسی نظر پیدا کرلیں کہ ہمارے لیے فنون لطیفہ کے نمونے زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں بن جائیں۔

پروفیسر مجیب نے تاریخ تمدن کے مسائل سے بحث کرتے ہوئے ان کی تہذیب پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے یونانیوں اور رومیوں کی مثالیں دے کر بتایا کہ ان سے دنیا نے سبق سیکھا لیکن مسلمانوں کی سیاست میں بہت جلد انتشار پیدا ہوگیا لیکن تہذیب کے بعض اصولوں کو جیسے کہ مساوات کی تعلیم جو اسلام نے دی ہے سیاست ہی رائج اور مقبول بنا سکتی تھی۔ اس کتاب کے لکھنے سے متعلق وجوہ کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ ''ہندوستانی تہذیب کی یہ ناقص داستان اس امید میں لکھی گئی ہے کہ اس کے پڑھنے والے اس کو اپنی تاریخ سمجھیں گے، اس میں جو حالات بیان کیے گئے ہیں ان کو اپنی زندگی کے حالات جان کر ان پر غور کریں گے، اس میں جو رائے ظاہر کی گئی ہے اسے جانچیں گے، کچھ قبول کریں گے کچھ رد کردیں گے اور اس طرح وہ تاریخ مرتب کریں گے جو کسی کتاب میں بند نہیں ہوتی، زندگی کی طرح پھیلی ہوئی اور آزاد ہوتی ہے، جس کی تصویر ہزار رنگوں کے ملنے سے بنتی ہے اور جس کی داستان ہزار کیفیتوں کا ایک مجموعی نام ہے۔''

ان اصولوں کو کسوٹی بنا کر مصنف نے تمدن کے آغاز سے متعلق تاریخ کے چند دیگر علوم سے رشتہ قائم کیا ہے اور علم الانسان، آثار قدیمہ، ہندوستان کی نسلوں، مکانات، وضع قطع اور لباس کے علاوہ کاروبار کی صنفوں سے بحث کی ہے، ان کے عقائد پر روشنی ڈالی ہے اور آریائی اور سندھی تہذیب کا موازنہ کیا ہے۔ اس طرح دوسرے باب میں آریوں کے تمدن سے بحث کرتے ہوئے ان کی تاریخ کے مآخذ (1) وید (2) اپنشد (3) سوتر اور رزمیہ داستانوں کے علاوہ ذاتوں کی تفہیم اور دینی تصورات کا جائزہ لیا ہے۔ تیسرے باب میں بدھ مت کے تحت اس کا ذہنی پس منظر، مشرقی ہند کا ذہنی پس منظر اور تمدن گوتم بدھ اور مہاویر کے حالات اور ان کی تعلیمات، کا جائزہ لیا گیا ہے۔

چوتھا باب موریا عہد کے لیے وقف ہے جس میں اشوک بھی شامل ہے۔ پانچویں باب میں ہندوستان، ایران اور یونان کے حالات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے، چھٹے باب میں گپت عہد کا جائزہ لیا گیا ہے، ساتویں باب میں ہیون سانگ اور البیرونی کو موضوع بنایا گیا ہے اور آٹھویں باب میں دکن اور جنوبی ہند کی تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔

غرض یہ کہ مجیب خاں نے 279 صفحات میں ہندوستان کے تمدن کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے اور سچ پوچھیے تو انھوں نے اپنے مستند تاریخ داں ہونے کا حق ادا کردیا ہے۔

● انیس کے سلام

مرتب: علی جواد زیدی

صفحات: 307، قیمت: 60 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔66

مبصر: احمد کفیل، 29۔اولڈ برہم پتر ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی۔67

اردو کی شعری اصناف میں "سلام" کا ظہور مرثیے کے بطن سے ہوا۔ سلام کے ابتدائی نقوش عربی اور فارسی شاعری میں مل تو جاتے ہیں لیکن ایک جداگانہ صنف کے طور پر یہ صنف اردو میں ہی پھلی پھولی۔ ہیئت کے اعتبار سے غزل، سہرا اور سلام کو شئے واحد تصور کیا جاتا ہے۔ غزل کے تشکیلی مزاج میں عشق اور سلام کو اعتقاد کے طور پر انفرادیت حاصل ہے۔ یہ وہ اعتقاد ہے جس میں، اخلاقی، منقبتی، رثائی، مدحیہ اور بھکتی جیسے موضوعات شامل ہوتے ہیں۔ سلام کی اصل شناخت اس کے اندرونی آہنگ سے ہوتی ہے۔ سلام میں غزل کی طرح بطور مضامین، واردات قلبیہ اور معاملات ذہنیہ باندھے جاتے ہیں۔

اردو میں سلام کی ابتدا شمالی ہند میں محمد شاہ رنگیلے کے عہد سے ہوئی۔ ابتدائی دور کے سلام پر اعتقاد کی فضا چھائی ہوئی تھی جس کا مقصد سرکار رسالت میں نذرانہ عقیدت و احترام پیش کرنا یا پھر امام عالی مقام سے اظہار عقیدت اور سوگواروں سے اظہار تعزیت کرنا ہوتا تھا۔ اس دور کے سلام نویسوں میں مسکین، فضلی، خادم اور جاں فشاں وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ بعد میں ولی، شاکر ناجی اور مصطفےٰ خاں یک رنگ نے سلام گوئی کو فروغ دیا۔ سلام گوئی کا ابتدائی رنگ میر و سودا کے زمانے تک قائم رہا۔ اسی دور میں میرانیس کے پردادا میر ضاحک حسین کی کلیات میں سلام کثیر تعداد میں ملتے ہیں۔ متقدمین نے مثلث، مربع، اور ترکیب بند کی ہیئتوں میں بھی سلام لکھے ہیں لیکن میر ضاحک سے لے کر مصحفی و میر کے دور میں سلام نویسی کے لیے غزل کی ہیئت اختیار کی گئی اور اس کے مضامین میں اعتقاد کے علاوہ ادبی موضوعات یعنی معاملات ذہنیہ اور واردات قلبیہ کو بھی جگہ ملی۔ ضمیر، فصیح، دلگیر اور خلیق نے اس صنف کو مزید آگے بڑھایا اور اپنا معتبر لہجہ قائم کیا۔ دبیر نے بھی خاصی تعداد میں سلام کہے مگر ان کا بھی رنگ رثائی نوعیت کا رہا۔ یہی صنف جب انیس و مونس تک پہنچی تو اس میں ایک جدید ادبی لب ولہجہ قائم ہوا۔

ایک موضوعاتی صنف سخن کی حیثیت سے انیس نے سلام کو ترقی کی راہ دکھائی۔ انھوں نے سلام میں منقبتی اور اخلاقی مضامین کو ہلکے متغزلانہ طرز میں ادا کرنے کی بنیاد ڈالی لیکن انھوں نے رثائی سانچے کو یکسر ترک بھی نہیں کیا۔

انیس نے اپنے سلاموں میں رثائی موضوعات کے علاوہ ذاتی مسائل، زمانے کی ناقدری، معاصرین کا حسد، نقالوں، خوشہ چینوں، مضمون دزدوں، جیسے مضامین اور بلند خیالی کو جگہ دی۔ انیس کی سلام نویسی کے اس پہلو پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ سلام کا خمیر جمالیاتی احساس توازن، خلوص، دردمندی، بلند بینی، معیار پسندی، اخلاق اور انسان دوستی سے عبارت ہے۔ نمونتاً میر انیس کا یہ مشہور سلام دیکھیے:

سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو
یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعف پیری نے
چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو
کہاں تھا حر، کدھر آیا، یہ بخت یاور تھا
نثار شہ پہ ہوا مار کر لعینوں کو
علم لیے ہوئے عباس نکلے خیمے سے
چڑھا لیا علی اکبر نے آستینوں کو
لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
غلط یہ لفظ، وہ بندش بری، یہ مضموں سست
ہنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو
بشر کو چاہیے دنیا میں اس کے حسن سے عشق
کہ جس نے خلق میں پیدا کیا حسینوں کو
خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

انیس کے سلام میں متغزلانہ اشعار بھی در آئے ہیں لیکن ان کا اخلاقی اور رثائی آہنگ انھیں غزلوں سے الگ کرتا ہے۔ مراثی انیس میں جس طور پر ہم اردو شاعری کے بالیدہ ذہن وتخیل کا مطالعہ کرتے ہیں اسی طرح ان کے سلام بھی وسعت خیال کی نیرنگیوں سے محظوظ کراتے ہیں۔

انیس کے سلام اس سے قبل بھی کئی مطبعوں سے شائع ہو چکے ہیں۔ "ذخیرۂ ثواب" اور "شمع تعزیت" کو شائع ہوئے لگ بھگ سو سال ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ "مراثی انیس" کی مطبوعہ جلدوں میں بھی ان کے سلام شائع ہوتے رہے ہیں۔ سیّد جعفر حسن نے "گلدستۂ انیس" کے نام سے انیس کے سلاموں کو مرتب کیا تھا۔ پاکستان سے "تجلیات انیس" کے نام سے ان کے سلاموں کا مجموعہ خاندان انیس کے ہی ایک فرد سید یوسف حسین شائق نے شائع کیا۔ اس کے باوجود انیس کے سلاموں کے جتنے مجموعے اب تک شائع ہوئے ہیں ان میں "انیس کے سلام" مرتب: علی جواد زیدی پہلا جامع مجموعہ

ہے جس میں انیس کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ سلام شامل کر لیے گئے ہیں۔ اس مجموعے میں سلاموں کی تعداد 102 ہے۔ ان میں تحت اللفظ چوالیس اور سوز کے اٹھاون سلام میں، نوحے چودہ، تضمین تین اور مناجات و مخمس منقبتی ایک ایک ہیں۔ حواشی کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے مرتب کرنے میں تقابل کا کام ہر ممکن احتیاط سے کیا گیا ہے۔ بہت سی جگہوں پر اغلاط کی تکرار ہوتی چلی آرہی تھی ان کی نشاندہی بھی علی جواد زیدی نے کردی ہے۔ ریاست محمود آباد کے کتب خانے میں انیس کے سلاموں کا ایک نادر مجموعہ ہے اسی کے مندرجات زیر تبصرہ مجموعے کی بنیاد ہیں۔ یہ نسخہ غالباً سید محمد عباس آصف نبیرۂ میر انیس کا مرتب کیا ہوا خاندان انیس کے ذخیروں پر مبنی ہے۔ علی جواد زیدی نے انیس کے سلاموں کے شائع شدہ دیگر مجموعوں کے علاوہ ''خانوادۂ انیس کے نوحے'' (مطبوعہ کراچی) اور ''مراثی انیس'' جلد پنجم (بک لینڈ، کراچی) سے بھی استفادہ کیا ہے۔

● **نئی شعری روایت**

مصنف: شمیم حنفی

صفحات: 240، قیمت: 127 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 66

مبصر: شعیب رضا فاطمی، 1/135، سی پی جے بلاک، نیو سیلم پور، دہلی-53

اردو ادب کے موجودہ منظرنامے میں پروفیسر شمیم حنفی محتاج تعارف نہیں ہیں۔ فکشن ہو یا شاعری جب وہ اپنے طویل تجربات مطالعہ کی روشنی میں اس کا جائزہ لیتے ہیں تو پسِ متن چلنے والی زیریں لہریں بھی سطح متن پر ابھرتی ہوئی موجوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ اپنے موضوع کا حق ادا کرنے میں انھیں یوں بھی کوئی دقت پیش نہیں آتی کہ وہ اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے مشرق کے ساتھ مغرب میں لکھے جارہے ادب پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں اور دنیائے ادب میں برپا ہونے والی نت نئی تبدیلیوں نیز، رجحانوں اور تحریکات سے پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ ''جدیدیت کی فلسفیانہ اساس''، ''کہانیوں کے پانچ رنگ''، ''جدید اردو غزل'' اور ''ہمسفروں کے درمیان'' جیسی معروف تصانیف کے علاوہ بھی کتنے ایسے مضامین ہیں جو ملک اور بیرونِ ملک کے ادبی رسائل کی زینت بنتے رہے ہیں اور جن سے مختلف النوع ابعادِ ادب کے دروا ہوئے ہیں۔

زیرِ نظر تصنیف ''نئی شعری روایت'' تین مستقل ابواب بعنوان ''بیسویں صدی کی اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت اور اس کے مضمرات''، ''نئی جمالیات'' اور ''تخلیقی عمل اور اظہار و ابلاغ کے مسائل'' پر مبنی ہے۔

موصوف نے جدید شاعری پر فراق گورکھپوری کی جارحانہ تنقید کے ایک اقتباس کو کتاب کے اولین صفحے پر جگہ دی ہے جس میں فراق نے لکھا ہے کہ ''جدید شاعری میں سب کچھ ہے اگر نہیں ہے تو عظمت''۔ فاضل مصنف نے اس اقتباس کے توسط زیرِ نظر کتاب میں جدید شاعری کی اساس پر مدلل گفتگو کی ہے اور واضح کیا ہے کہ ''جدیدیت ہر اس تجربے کو اور ہر اس مظہر کو نئے انسان سے منسلک سمجھتی ہے جو اس کی شخصیت اور مسائل کے کسی پہلو سے ربط رکھتا ہے، خواہ تاریخی، سماجی اور عقلی اعتبار سے وہ کتنا ہی مجہول اور فرسودہ کیوں نہ سمجھا جائے، اصل شرط نئی حقیقتوں کے ادراک اور نئے طرز احساس کی ہے۔''

128 صفحات پر محیط پہلے باب میں مصنف نے جدید شاعری کی روایت اور اس کے مضمرات پر روشنی ڈالنے کے لیے جہاں جدیدیت سے متاثر اور جدیدیت کے محرک یوروپین ناقدین کے حوالے دیے ہیں وہیں ن۔م۔ راشد اور میراجی کے خیالات و افکار کی روشنی میں سلیم الرحمن، عمیق حنفی، افتخار جالب، ناصر کاظمی، ضیا جالندھری، منیب الرحمن، محمد علوی، انیس ناگی، زاہد ڈار، اختر الایمان، ساقی فاروقی، سلیم الرحمن، شہریار، کمار پاشی، شکیب جلالی، مجید امجد، شمس الرحمن فاروقی، ظفر اقبال، بلراج کومل، عزیز قیسی، وحید اختر، باقر مہدی، عادل منصوری، خلیل الرحمن اعظمی، جیلانی کامران، جیسے معتبر شعرا کے کلام کی مثالوں سے اس باب کو مکمل کیا ہے۔

پہلے باب میں نئی شاعری کے پس منظر پر مبسوط گفتگو کرنے کے بعد دوسرے باب کے شروع میں ہی اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''فن کی آزادانہ حیثیت میں یقین نے فنی اور لسانی اعتبار سے بھی نئی شاعری کو اپنی پیشرو شاعری کی بہ نسبت پیچیدہ تر بنا دیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر فن کی طرح شاعری میں کاریگری اور تکنیک ہے لیکن یہ تکنیک کسی بتائے ہوئے طریقے کے میکانکی معمول کی آفریدہ نہیں ہوتی... اس لیے ہر شاعر کے مطالعے میں اس کے انفرادی طریق کار اور استعداد نیز زبان کی طرف اس کے ذاتی رویوں کی تلاش و تفہیم ناگزیر ہے۔''

اس سلسلے میں جہاں وہ فنی و لسانی روایت سے استفادے کو ضروری قرار دیتے ہیں وہیں افتخار جالب کے حوالے سے روایت کی نفی کو ایک قوی الاثر میلان قرار دیتے ہیں۔ لسانی تشکیلات کے سلسلے میں افتخار جالب نے جن امور کی نشاندہی کی ہے اس کے نکات بھی زیر بحث لاتے ہیں۔

تیسرا اور آخری باب ''نئی شاعری: تخلیقی عمل: اظہار و ابلاغ کے مسائل'' میں فاضل مصنف فرماتے ہیں کہ ''تخلیقی اظہار کے مسائل کو سمجھنے کے لیے یہاں شاعری کو دو الگ الگ دائروں میں رکھنا ضروری ہے، اولاً شعری وہ ہئیتیں جن کا ردِ عمل قاری پر فوری ہوتا ہے، ثانیاً وہ جنھیں قاری زینہ بہ زینہ سمجھتا

جاتا ہے اور بالآخر ایک ایسے کلیدی تاثر کی دریافت کرتا ہے جسے ان کا جوہر کہنا چاہیے۔''

اس باب میں پروفیسر شمیم حنفی نے صرف خیال یا صرف تاثر یا صرف نظریے کو شاعری کے اوصاف میں شامل نہیں کیا ہے بلکہ یہ کہا ہے کہ ''معنی خیز شعری تجربہ ہمیشہ کثیر الابعاد ہوتا ہے'' ان کا ماننا ہے کہ آسان اور عام فہم یعنی بالکل سامنے کی بات بھی قاری کے لیے انکشاف ثابت ہو۔ اس باب میں فاضل مصنف نے قرأت کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے اور فرمایا ہے کہ ''شعر کی غلط قرأت بھی کبھی کبھی معنی کے اصل جوہر کو بے نقاب نہیں ہونے دیتی۔''

''پس نوشت'' میں مصنف اپنے فکری تجربات کی روشنی میں نئی شاعری کے حوالے سے فرماتے ہیں:

''بے روح تجربہ پسندی سے ناآسودگی کا میلان قوی تر ہوا ہے۔ شعروادب کے لسانی صداقت کے تصور میں پھیلاؤ پہلے سے کہیں زیادہ نمایاں ہوا ہے۔ اب ادب سے زندگی کے حوالے کو منہا کرنے کے بجائے اسے ایک طرح کی مرکزی حیثیت دی جانے لگی ہے اور اس یقین پر بھروسہ بڑھا ہے کہ ادب کا مطالعہ بہرحال مردہ سلائڈس کا مطالعہ نہیں ہے۔ ہر تخلیقی تجربے کا محور انسان ہے اور اسی سے وابستہ اندھیرے اجالے مجموعی انسانی صورتِ حال کا خاکہ مرتب کرتے ہیں۔''

نئی شاعری پر لکھی جانے والی تحریروں میں زیرِ تبصرہ کتاب اپنی انفرادی شان رکھتی ہے اور اس حوالے سے کام کرنے والے اسکالرز ہی نہیں اساتذہ کے لیے بھی نہایت کارآمد ہے۔

● خوش کلامیاں قلم کاروں کی

مرتب: نارنگ ساقی

صفحات: 355، قیمت: 200 روپے

ناشر: ایم آر پبلیکیشنز، 2695 کالے خاں اسٹریٹ، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی-2

مبصر: رفیق جعفر

اردو ادبی حلقوں میں نارنگ ساقی کی شہرت کسی بھی مشہور ادیب یا شاعر کی شہرت سے کم نہیں، اس کی وجہ ان کی ادب سے دلچسپی کے علاوہ ادیبوں اور شاعروں سے قربت اور اردو والوں سے بے لوث پیار ہے۔ ان کی باغ و بہار شخصیت کے چرچے عام ہیں۔ اردو سے محبت، ادب سے لگاؤ اور ادیبوں اور شاعروں کی قربت نے انھیں نہ صرف اچھا قاری اور سامع بنایا بلکہ ان میں ترتیب اور تخلیق کا ذوق بھی پیدا کر دیا۔ اردو ساقی صاحب کی مادری زبان نہیں، اردو سے ان کا رشتہ محبت کا ہے۔ محبت میں گرفتار اس بندے نے ''خوش کلامیاں قلم کاروں کی'' نام سے ادبی لطائف کی کتاب مرتب کر کے ایک ایسا کام انجام دیا ہے جس کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ اس کتاب کا انتساب اردو کے دو قد آور شاعروں کے نام ہے: کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور قتیل شفائی، بقول ساقی انھی کی قربتوں نے انھیں اردو دنیا سے آشنا کیا۔

''خوش کلامیاں قلم کاروں کی'' میں گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، قمر رئیس، خلیق انجم، مجتبیٰ حسین اور مشفق خواجہ جیسے مستند قلم کاروں نے ان کی شخصیت اور کام کی تحسین کی ہے۔ ساقی صاحب اس داد کے مستحق بھی ہیں۔ ''اپنی بات'' کے تحت نارنگ ساقی نے اپنے بارے میں کم اور طنز و مزاح کے بارے میں زیادہ گفتگو کی ہے۔ مختصر انداز میں انھوں نے ظرافت کی تاریخ بیان کر دی ہے۔ لہجہ پروقار، زبان شائستہ اور پُر اثر ہے اور مواد حقیقت پر مبنی۔ اس کتاب کے دیباچے میں شمس الرحمٰن فاروقی نے تحریر کیا ہے کہ:

''میں نے یہ کتاب رات دیر تک پڑھی بلکہ یوں کہیں کہ شروع کرنے کے بعد میں نے اسے ختم ہی کر کے دم لیا۔ اس زمانے میں ہنسنے ہنسانے کے مواقع یوں ہی بہت کم ہو گئے ہیں۔ پھر جب ہنسنے کا موقع فراہم کرنے والے خود ہمارے دوست یا دشمن یا حریف ہوں یعنی ساتھی ادیب و شاعر ہو تو ہنسنا زیادہ مزہ دیتا ہے۔''

دیباچے کا یہ اقتباس اس کتاب کا صحیح تعارف ہے۔ 355 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں جو لطیفے ہیں وہ پڑھنے بلکہ بار بار پڑھنے پر اکساتے اور مزہ دیتے ہیں۔ ادبی مذاق رکھنے والوں کو تو اور بھی لطف آتا ہے کیوں کہ اس میں کہیں زبان کا مزہ ہے تو کہیں تاریخ کا حوالہ ہے اور کہیں کسی مشہور واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ عام قاری کے لیے بھی اس میں گدگدی پیدا کرنے والے عناصر موجود ہیں۔ یہ اصل میں لطائف نہیں خوش کلامیاں ہی ہیں جن میں کہیں پھکڑ پن یا اخلاق سے گری ہوئی کوئی بات نہیں ہے بلکہ شائستہ خوش بیانیاں اور خوش کلامیاں ہی ہیں جن کی داد دیے بغیر رہا نہیں جا سکتا۔

کتاب میں ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور محققوں کے لطائف (خوش کلامیاں) زیادہ ہیں لیکن ان کے ساتھ کچھ مشہور سیاستدانوں، سماجی کارکنوں اور زندگی کے دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے بھی لطائف ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ لطیفے کا تعلق جس شخصیت سے ہے اس کی تاریخ پیدائش اور مرحومین کی تاریخ وفات بھی دی گئی ہے جو حوالوں کے کام آئے گی۔ کچھ شخصیتوں کے بارے میں انھوں نے جو جملے لکھے ہیں وہ مزہ دے جاتے ہیں۔ قابل مبارکباد ہیں نارنگ ساقی جنھوں نے اپنی طرز کی یہ کتاب مرتب کر کے اردو ادب کے سرمائے میں قابل قدر اور قابل ذکر اضافہ کیا ہے۔

● مجتبیٰ حسین بحیثیت طنز نگار

مصنف: ڈاکٹر افسر کاظمی

صفحات: 172، قیمت: 200 روپے

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 9 گولا مارکیٹ، دریا گنج، دہلی-2

مبصر: ڈاکٹر وسیم اقبال، محلہ قاضی سرائے اول، نگینہ، بجنور (یوپی)

عصرِ حاضر میں اردو ادب میں طنز و مزاح کا ذکر ہو اور مجتبیٰ حسین کا نام نہ لیا جائے، یہ ممکن ہی نہیں۔ مجتبیٰ حسین نے طنز و مزاح نگاری کو نہ صرف فروغ دیا بلکہ اسے اعتبار بھی بخشا۔ انشائیے، سفرنامے، اخباری کالم اور خاکے ان سب اصناف نثر میں مجتبیٰ حسین نے طبع آزمائی کی اور خوب کی۔ بچپن میں تعلیم کی لگن نے انھیں اپنے آبائی گاؤں چنچولی ضلع گلبرگہ، کرناٹک سے علم و ادب کی زرخیز زمین حیدرآباد کا سفر اختیار کرنے پر کیا مجبور کیا کہ جب سے آج تک ان کا یہ علمی و ادبی سفر جاری ہے اور انھوں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ چار دہائیوں سے زائد کے اپنے ادبی سفر میں مجتبیٰ حسین نے اردو طنز و مزاح میں جو اضافے کیے ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ مجتبیٰ حسین بنیادی طور پر مزاح نگار ہیں لیکن طنز کی خوبصورت آمیزش ان کے فن کو جلا بخشتی ہے۔

افسر کاظمی کی زیر تبصرہ کتاب "مجتبیٰ حسین: بحیثیت طنز نگار" 1999 میں لکھے گئے تحقیقی مقالے پر مشتمل ہے جس پر موصوف کو ڈاکٹریٹ کی سند حاصل ہوئی۔ کتاب کل چھ ابواب میں منقسم ہے۔ پہلے باب بعنوان "مجتبیٰ حسین کی سوانح حیات" میں مصنف نے مجتبیٰ حسین کا خاندانی شجرہ پیش کیا ہے اور مجتبیٰ حسین کی زندگی، ماحول اور تعلیم و تربیت پر مستند حوالوں سے روشنی ڈالی ہے جو اس لحاظ سے اہم ہے کہ خود مجتبیٰ حسین سے گفتگو کے بعد اسے ترتیب دیا گیا ہے۔

باب دوم "اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت" میں مصنف نے طنز و مزاح کی تعریف اور تاریخ بیان کی ہے جس کی تائید میں مختلف اقوال و نظریات کو پیش کیا ہے۔ اس باب میں مغربی ادب خصوصاً انگریزی کے طنز و مزاح کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ اردو میں طنز و مزاح کا تذکرہ ابتدا سے بیسویں صدی کے اختتام تک تفصیل کے ساتھ ہوا ہے اور اس درمیان میں طنز و مزاح جن مراحل سے گزرا اس پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

باب سوم "مجتبیٰ حسین بحیثیت طنز نگار" میں مصنف نے مجتبیٰ حسین کی طنز نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی تحریروں کے طویل اقتباسات پیش کر کے امتیازی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے اور دکھایا ہے کہ مجتبیٰ حسین اپنے مضامین کے لیے مواد معاشرتی زندگی اور سماجی سرگرمیوں سے اخذ کرتے ہیں۔

باب چہارم "مجتبیٰ حسین کا اسلوب" میں اسلوب نثر سے بحث کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ مجتبیٰ حسین کے اسلوب میں ایک خاص دلکشی ہے اور ان کا اسلوب تحریر مسخرگی اور پھکڑپن سے پاک ہے۔

باب پنجم "معاصرین" میں مجتبیٰ حسین کے معاصر طنز و مزاح نگاروں کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے اسلوب نثر کا جائزہ طویل اقتباسات کی روشنی میں لیا ہے۔ افسر کاظمی کا خیال ہے کہ مجتبیٰ حسین کے معاصرین میں ان جیسے انہماک و اخلاص کے ساتھ کسی اور نے طنز و ظرافت کو وسیلۂ اظہار نہیں بنایا۔ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس پر گفتگو کی خاصی گنجائش ہے۔

باب ششم "نتیجہ" کے عنوان سے ہے جس میں مصنف نے پوری کتاب کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے مجتبیٰ حسین کی تحریروں کی اہم خصوصیات واضح کی ہیں۔ کتاب میں شامل نثار احمد فاروقی کا مضمون افسر کاظمی کی اس تحقیقی اور تنقیدی تصنیف کے مثبت و منفی دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہ افسر کاظمی کی دیانت داری ہے کہ انھوں نے بلا کم و کاست پورا مقالہ مضمون کتاب کر لیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بہتر رہنمائی کی تلاش میں ہیں۔ یہ بات بالوثوق کہی جاسکتی ہے کہ افسر کاظمی کی یہ کتاب طنز و مزاح پر عموماً اور مجتبیٰ حسین پر کام کرنے والوں کے لیے خصوصاً مفید ثابت ہوگی۔

● ترکش (جاوید دانش نمبر) سہ ماہی رسالہ

مدیر: فراغ روہوی

صفحات: 416، قیمت: 200 روپے

ناشر: 67، مولانا شوکت علی اسٹریٹ، کولکاتا-73

مبصر: سرفراز جاوید، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی-110007

کولکاتا سے نکلنے والا سہ ماہی رسالہ "ترکش"، (مدیر فراغ روہوی) کا حالیہ شمارہ "جاوید دانش نمبر" ہے۔ "ترکش" نے بہت قلیل عرصے میں ادبی حلقوں میں اپنی ایک شناخت قائم کر لی ہے۔

جاوید دانش صنف ڈراما سے ایک خاص تعلق رکھتے ہیں، گو کہ وہ شاعر بھی ہیں اور انشا پرداز بھی۔ ان کے سفرناموں "آوارگی" اور "مزید آوارگی" نے بھی اردو دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی ہے۔

ترکش کا یہ شمارہ 416 صفحات پر محیط 13 عنوانات جیسے اداریہ، مہمان اداریہ، پیکر دانش، عکسِ دانش، قدر دانش، تمثیلِ دانش، آوارگی دانش، ترجمۂ دانش، فکرِ دانش، انتخاب دانش، صدائے بازگشت، نگاہِ دوستاں اور آئینے میں منقسم ہے۔ شمارے میں اداریہ فراغ روہوی نے لکھا ہے اور بطور مہمان مدیر پروفیسر ابوذر ہاشمی نے "ز دانش بگوید زبانِ قلم" کے عنوان سے مہمان اداریہ قلمبند کیا ہے جو اس نمبر میں شامل مضامین میں ایک اہم مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔

پیکر دانش کے حصے میں پانچ مضامین ہیں۔ یہ ان رشتے داروں اور رفقا کے ہیں جو جاوید دانش سے قریبی شناسائی رکھتے ہیں۔ سید صاحب نے ان کی

قلندرانہ شخصیت پر روشنی ڈالی ہے۔ زینت رشید دانش کی ہمشیرہ نے اپنے بھائی کی شخصیت کے متاصر حسن سلوک، اخلاق، حوصلہ مندی اور بچپن سے اب تک کے طرز حیات کو صفحۂ قرطاس پر اتارا ہے۔ دانش کے بھانجے احتشام جمیل نے اپنے ماموں کی شخصیت کی دو دیشانہ صفات کو مضمون کی شکل دی ہے۔

مجتبیٰ حسین نے دانش کے سفرنامے ''آوارگی'' پر ''آوارگی کچھ میری کچھ دانش کی'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے قلم نے آوارگی کی معنی آفرینی میں اضافہ کردیا ہے۔ ظہیر انور کا خیال ہے کہ آوارگی کے مطالعے سے قاری اپنی معلومات میں بہت کچھ اضافہ کرسکتا ہے۔ ''عکس دانش'' کے حصے میں بھی پانچ مضامین شامل ہیں۔ ''میرے بابا جاوید دانش'' میں ریاض احمد نے عدیل صاحب سے بالمشافہ گفتگو کے ذریعے دانش کے بچوں کے ساتھ جذباتی اور اخلاقی لگاؤ کو پیش کیا ہے۔ نثار رشید نے ''ایک مکالمہ عظمیٰ دانش سے'' میں ان دونوں کی شخصیت کی مکاسی کی ہے۔ روحی ارغوانی نے ''پسند آپ کی'' میں دانش کی پسندیدہ کتابوں اور ان کے مصنفوں کے متعلق گفتگو اپنی ماوری زبان سے ان کے لگاؤ کو واضح کیا ہے۔ سعدیہ صدف نے ''انکل دانش سے گفتگو'' میں فیاض حیدر کا مضمون، جاوید دانش کی محنت اور اس کے صابر اور شاکر ہونے پر روشنی ڈالتا ہے۔ ''قدر دانش'' کے حصے میں اعزاز افضل اور ابوالمنذر کے قطعات ان کی شخصیت اور مجری زندگی کو پیش کرتے ہیں۔

''تمثیل دانش'' بتیس مضامین پر مشتمل ہے۔ ان مضامین میں جاوید دانش کے ڈرامائی ادب کا بھرپور تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ ان کے ڈرامے انسان کے بھری تجربات اور دو ثقافتوں کی کشمکش کا آئینہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان دونوں ثقافتوں کی کشمکش کا کرب اس وقت دو چند ہو جاتا ہے جب مہاجرین کی نئی نسل اپنے آباواجداد کی ثقافت کو قبول کرنے سے انکار کردیتی ہے۔ ان کے ڈراموں کی اس اہم خصوصیت کو تمام مقالہ نگاروں نے پیش کیا ہے۔

''آوارگی دانش'' چودہ مضامین پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں ان کے سفرناموں ''آوارگی'' اور ''مزید آوارگی'' کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ ''ترجمۂ دانش'' میں دو مضامین شامل ہیں جو ان کے تراجم پر ہیں۔ ''فکر دانش'' میں تین مضامین شامل ہیں، جن میں دانش کی چند نظموں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے جو ان کی شاعرانہ صلاحیت کو سمجھنے میں معاون ہیں۔ ''انتخاب دانش'' میں دانش کے ڈراما ''کنوارے بھلے'' کو رکھا گیا ہے جو ایک پرتجسس ڈراما ہے۔ یہ ڈراما مغربی اور مشرقی کلچر کے درپیش مسائل اور مہاجرین کی کشمکش حیات کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔

''صدائے بازگشت'' میں عصر حاضر کے ممتاز ناقدین کی جاوید دانش کے متعلق آرا کو پیش کیا گیا ہے اور ''نگاہ دوستاں'' میں احباب کے خطوط پیش کیے گئے ہیں اور آخیر میں کچھ تصاویر۔

یقیناً ترکش کا یہ جاوید دانش نمبر ادبی سماج کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائے گا اور جاوید دانش پر کام کرنے والوں کو مواد کی فراہمی میں معاونت کرے گا۔

□□□

دیوان درد

مرتب: ڈاکٹر نسیم احمد

خواجہ میر درد اردو کے صرف صوفی شاعر ہی نہیں بلکہ ان کی غزلیہ شاعری غزل کی اس توانا روایت کا حصہ ہے جس کی نمائندگی اعلیٰ سطح پر میر تقی میر کررہے تھے لیکن افسوس کہ درد کی وفات کے بہت بعد ان کے کلام کی اشاعت ہو پائی اور وہ بھی اختلافات متن کے ساتھ۔ ہند و پاک میں ''انتخاب کلام درد'' اور ''دیوان درد'' کے انھی متعدد مطبوعہ و غیر مطبوعہ نسخوں کے پیش نظر ڈاکٹر نسیم احمد نے ''دیوان درد'' کا یہ نسخہ ترتیب دیا ہے اور اس کی تفصیلی وضاحت مقدمے میں کردی ہے۔

صفحات: 336، قیمت:-/160 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

آئینۂ جہاں (کلیات قرۃ العین حیدر)

''آئینۂ جہاں'' جلد اوّل

قرۃ العین حیدر نے قدیم وجدید ہندوستانی تہذیب کو جس خوبصورتی اور فن کارانہ مہارت کے ساتھ اپنی تحریروں میں سمویا ہے وہ انھی کا حصہ ہے۔ کلیات کی اس پہلی جلد میں 35 افسانے شامل ہیں جو گذشتہ ساٹھ ستر سال کے تیزی سے بدلتے ہوئے سماجی منظرنامے کی جھلکیاں پیش کرتے ہیں۔ یہ افسانے اس وقت لکھے گئے جب مصنفہ کا تعلیمی سلسلہ جاری تھا اور ان کے بقول اس مجموعے کے کئی افسانے یونیورسٹی کے افسانوی ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔

صفحات—600، قیمت— 266 روپے

''آئینۂ جہاں'' جلد دوم

''آئینۂ جہاں'' جلد دوم میں 32 افسانے شامل ہیں جن میں ''فقیروں کی پہاڑی''، ''فوٹوگرافر''، ''روشنی کی رفتار''، ''یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے'' اور ''آوارہ گرد'' جیسے افسانے بھی ہیں جو اردو افسانے کے سخت سے سخت انتخاب میں شامل کیے جاسکتے ہیں تو دوسری طرف ''دکھلایئے لے جاکے تجھے مصر کا بازار'' اور ''میں بوری ڈوبت ڈوری'' جیسے افسانے بھی ہیں جن سے قرۃ العین حیدر کے ذہنی ارتقا کا اندازہ ہوتا ہے۔

صفحات—612، قیمت — 270 روپے

''آئینۂ جہاں'' جلد سوم

''آئینۂ جہاں'' کی اس تیسری جلد میں قرۃ العین حیدر کے پانچ ناولٹ — ''سیتاہرن''، ''چائے کے باغ''، ''ہاؤسنگ سوسائٹی''، ''اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو'' اور ''دل ربا'' تاریخی ترتیب سے شامل ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے پورے فکشن بشمول ناولٹ میں اپنے تجربات ومشاہدات کو مختلف خواتین کے کردار میں پیش کیا ہے جو زندگی میں ہر قدم پر مصالحت کرتی آرہی تھیں لیکن آج اصولوں کی خاطر جان کی بازی لگانے پر آمادہ ہیں۔ پیانو، پکھراج اور گٹار بجانے والی، روشنی کی رفتار سے پرواز کرنے والی اب ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں کی متلاشی ہے۔

صفحات—502، قیمت—230 روپے

''آئینۂ جہاں'' جلد چہارم

وقت اور تہذیب کی قلابازیوں کی حسین تفسیر بیان کرنے میں قرۃ العین حیدر کو مہارت کاملہ حاصل ہے۔ عہد ایسٹ انڈیا کمپنی سے ہندوستان میں جس دورنگی معاشرت کی نمود ہوئی اور اس وقت سے لے کر اب تک ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب جن نشیب وفراز سے دوچار ہوئی ان کی جھلکیاں جلد چہارم کے افسانوں میں دکھائی دیتی ہیں۔ اس جلد میں قرۃ العین حیدر کے ایسے اکیس افسانے شامل ہیں جو اب تک ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ اس میں ان کا وہ اوّلین افسانہ بھی ہے جو ''ایک شام'' کے عنوان سے ''اویب'' نومبر 1943 میں ''لالہ رخ'' کے فرضی نام سے شائع ہوا تھا۔

صفحات—758، قیمت—384 روپے

● چاروں جلدوں کے مرتب جمیل اختر ہیں جنھوں نے مصنفہ کی نگرانی میں یہ اہم کام انجام دیا ہے۔

نوٹ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔
شعبۂ فروخت، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

شرجیل احمد خاں

ایک عجیب وغریب تحفہ

کسی زمانے میں دیوتاؤں کا دیوتا جوپیٹر (Jupiter) اہل زمین (دنیا) سے بہت ناراض تھا۔ اس کی ناراضگی کی وجہ یہ تھی کہ کسی دوسرے دیوتا نے بہشت سے آگ چرا کر انسانوں کو دے دی تھی۔ غصے کے عالم میں جوپیٹر نے یہ فیصلہ کیا کہ انسانوں کو ایک اور تحفہ دیا جائے جو بظاہر تو مفید لگے لیکن بعد میں انسانوں کے لیے نقصان کا باعث ہو۔ دیوتا یہ سوچ کر مسکرایا کہ حقیر انسان کی کیا کیفیت ہوگی جب وہ میری سازش کا شکار بنیں گے۔ اس نے ولکن (Vulcan) کو حکم دیا کہ وہ مٹی سے ایک ایسی عورت کی مورتی بنائے جو حسن ورعنائی میں دیویوں سے بھی سبقت لے جائے۔ ولکن ایک ماہر کاریگر تھا۔ اس نے ایک ایسی مورت تیار کی جو پگمیلین (Pygmallion) کے ہاتھوں بنائی گئی مورتی سے کہیں زیادہ حسین اور پُرکشش تھی۔ دوسرے دیوی دیوتاؤں نے بھی اس کو خوبصورت بنانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، یہاں تک کہ مورتی میں سے ایک نہایت ہی حسین وجمیل دوشیزہ برآمد ہوئی لیکن ولکن جس کو اپنی کاریگری پر بڑا ناز تھا، مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے ایک عمدہ اور نفیس تاج بنایا اور اس سے دوشیزہ کی تاج پوشی کی۔

جوپیٹر کو یقین تھا کہ ایسا حسین تحفہ نامنظور نہیں کیا جائے گا۔ اس نے حکم دیا کہ دوشیزہ کو پنڈورا (Pandora) کے نام سے پکارا جائے اور اس کو اپی میتھیس (Epimetheus) کے دربار میں بھیج دیا جائے۔ مرکری (Mercury) دیوتا نے بڑی سرعت کے ساتھ اس کو آسمان سے اتارا اور اپی میتھیس کے پاس لے گیا۔ اپی میتھیس نے بڑی خوشی سے دوشیزہ کا استقبال کیا۔ حالانکہ اس کو آگاہ کر دیا گیا تھا کہ وہ بہشت سے آیا ہوا کوئی تحفہ قبول نہ کرے ورنہ زمین پر آفت نازل ہوگی۔ لیکن وہ دوشیزہ کے حسن سے اتنا مسحور ہو گیا تھا کہ اپنے دل پر قابو نہیں رکھ سکا اور اس دوشیزہ سے شادی رچالی۔ بہت دنوں تک دونوں ہنسی خوشی ایک ساتھ رہے۔ اپی میتھیس کو یہ خیال بھی نہیں گزرا کہ کوئی آفت آسکتی ہے بلکہ اپنی حسین بیوی کی موجودگی میں اسے آفت کا خیال بھی مضحکہ خیز معلوم ہوا۔

مگر دیوتا اپنا منشا قطعی نہیں بھولتے۔ جوپیٹر نے ایک دوسرا تحفہ محل میں بھیجا۔ یہ تحفہ دلکش نقش ونگار سے مزین ایک ٹوکری تھی جس پر لکھا تھا... ''دیوتا کی اجازت کے بغیر ٹوکری نہ کھولی جائے۔'' پنڈورا کے دل میں ٹوکری کھولنے کی زبردست خواہش پیدا ہوئی، لیکن وہ ضبط کیے رہی۔ وہ اپنے شوہر سے بے انتہا پیار کرتی تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ اس پر کسی طرح کی آفت آئے۔ مگر جوپیٹر کا منشا اس کی قوت صبر پر غالب آگیا اور فرط تجسس سے مغلوب ہوکر آخر کار اس نے ٹوکری کا ڈھکن کھول دیا۔ پھر کیا تھا، فضا عجیب وغریب چیزوں سے بھر گئی۔ پنڈورا جان گئی کہ عفریت اس دنیا کو تباہ وبرباد کر دے گا۔ چنانچہ اس نے ٹوکری کا ڈھکنا جلدی جلدی بند کر دیا لیکن تمام عفریت تو باہر آچکے تھے، صرف امید بچ رہی تھی۔ جیوپیٹر نہیں چاہتا تھا، لیکن پھر بھی اس نے امید کو رہنے دیا۔

اور آج بھی شاعر نغمہ سرا ہے۔ ''انسان کا دل امید کا مسکن ہے اور یہ امید تا قیامت شر اور برائی سے لڑنے کی قوت بخشتی رہے گی.....!''

پنڈورا اپنے شوہر کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگی۔ دونوں کا سہارا ''امید'' تھی جسے انھوں نے خداوند سے حاصل کیا تھا۔!! □□□

پتہ:
3-Bhaikanpur, Bhagalpur-812001

خسرو متین

سانپوں کی دنیا

سانپ کا نام سنتے ہی پورے جسم میں خوف کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ بہادر اور مضبوط اعصاب کا آدمی بھی ہڑبڑا جاتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ عام تصور ہے کہ ہر سانپ زہریلا ہوتا ہے اور اس کے کاٹنے سے انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہ قیاس حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ یہ محض ہماری کم علمی اور سانپوں کے ساتھ ناانصافی ہے کیوں کہ ہر سانپ زہریلا نہیں ہوتا اور نہ ہی ہر سانپ کے کاٹنے سے موت واقع ہوتی ہے۔ پوری دنیا میں سانپ کی تقریباً 2500 اقسام پائی جاتی ہیں اور ان میں سے صرف 150 قسم کے سانپ ہی زہریلے ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک ہندوستان میں سانپ کی تقریباً 216 قسمیں پائی جاتی ہیں جن میں 52 قسم کے سانپ ہی زہریلے ہوتے ہیں۔

دنیا کا سب سے زہریلا سانپ آسٹریلیا میں پایا جانے والا ٹائیگر اسنیک ہے۔ یہ اس قدر زہریلا ہوتا ہے کہ ایک دن میں تقریباً سو آدمیوں کو کاٹ کر ہلاک کر سکتا ہے۔

دنیا کا سب سے چھوٹا سانپ تھریڈ اسنیک ہے۔ یہ سانپ کیریبین سمندر کے کنارے لوسا مارٹینگ اور واروڈوس جزیروں میں پایا جاتا ہے۔ اس کی لمبائی دس سے بارہ سینٹی میٹر ہوتی ہے۔ یہ دھاگے کی مانند باریک ہوتا ہے اس لیے اس کو تھریڈ اسنیک کہا جاتا ہے۔ دنیا کا سب سے لمبا سانپ ''ریٹی کولیٹڈ پے یوں'' (جالی دار اژدہا) ہے۔ عام طور سے اس کی لمبائی دس میٹر سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس کا وزن تقریباً ایک سو بیس کیلوگرام تک ہوتا ہے۔ یہ اژدہا جنوب مشرقی ایشیا اور فلپینس کے علاقوں میں پایا جاتا ہے۔

مغربی بحر ہند کے جزیرے راؤنڈ میں پایا جانے والا ''کیل سلیڈ وُوآ'' دنیا کا سب سے کم یاب سانپ ہے۔ دھیرے دھیرے اس کی نسل ختم ہوتی جا رہی ہے۔ پوری دنیا میں اس نسل کے سانپوں کی تعداد سو سے بھی کم ہے۔ حکومتیں اس معدوم ہوتی ہوئی سانپ کی نسل کو بچانے کی کوشش میں لگی ہوئی ہیں۔

سانپ کے پیر نہیں ہوتے مگر، ان کے اجداد کے ہوا کرتے تھے۔ یہ پیر دھیرے دھیرے ختم ہوتے چلے گئے۔ اژدہے کے تو آج بھی منہ کے قریب ایک جوڑی نامکمل پیر موجود ہیں لیکن ان کا استعمال چلنے یا رینگنے میں نہیں ہوتا، استعمال نہ ہونے کی وجہ سے باقی سانپوں کے پیر معدوم ہوتے چلے گئے۔

اژدہے کے پیٹ میں اتنے طاقتور کیمیاوی اجزا اور تیزاب ہوتے ہیں کہ وہ نگلے ہوئے جانور کی ہڈیوں تک کو گلا دیتے ہیں۔

دنیا میں کوئی بھی دو منہ والا سانپ نہیں پایا جاتا۔ کچھ سانپوں کی دُم منہ کی طرح دکھائی دیتی ہے جنھیں غلطی سے دو منہ والا سانپ سمجھ لیا جاتا ہے۔ پہلی مرتبہ گذشتہ دنوں دوسروں والا ایک سانپ پکڑا گیا ہے مگر اس کی حیثیت اتفاقی ہے۔ جس طرح کبھی کبھی دوسروں والے انسانی بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ سانپ بھی قدرت کی اس کاریگری کا کرشمہ ہے۔

ایک عام خیال یہ بھی ہے کہ اڑنے والا سانپ بھی پایا جاتا ہے۔ اس سانپ کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ پیڑوں پر رہتا ہے اور اپنے جسم کو انگریزی زبان کے حرف "S" کی طرح شکل دے کر ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ پر چھلانگ لگاتا ہے۔ اس کا جسم اسپرنگ کی مانند کام کرتا ہے۔

ایک مرتبہ میں یہ 5 میٹر کی چھلانگ لگاتا ہے۔

ریگستانی علاقوں میں پایا جانے والا وائپر نسل کا سانپ نہایت خطرناک ہوتا ہے۔ اس کو ریٹل اسنیک بھی کہتے ہیں۔ اس کی دم کے آخری حصے میں ہڈی کے چھلکے بنے ہوتے ہیں جن کو ہلانے سے جھنجھناہٹ کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ شکار کرتے وقت یہ اپنے آپ کو کسی پتھر یا جھاڑی میں چھپالیتا ہے اور دم کو ہلا کر جھنجھناہٹ کی آواز پیدا کرتا ہے۔ آواز سے چوہے اور چھوٹے موٹے جانور متوجہ ہوتے ہیں جنھیں ڈس کر یہ اپنا شکار بنالیتا ہے۔

زیادہ تر مادہ سانپ انڈے دیتی ہیں مگر کچھ نسلیں ایسی بھی پائی جاتی ہیں جو بچے دیتی ہیں جیسے وائپ اور ریڈ سینڈ ووآ وغیرہ۔ دنیا کا سب سے خوبصورت سانپ گولڈن ٹی اسنیک ہوتا ہے۔

ہمارے ملک میں ناگ پنچمی کے تہوار کے موقعے پر سانپوں کی پوجا ہوتی ہے۔ انھیں دودھ پلایا جاتا ہے اور انھیں ایک دیوتا کی مانند عزت دی جاتی ہے۔ انھیں ناگ دیوتا کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

سانپوں کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں اور روایتیں چلی آرہی ہیں۔ جیسے ہماری لوک کہانیوں میں اکثر اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ زمینی دفینوں کی حفاظت سانپ کرتے ہیں اور انسانی بھینٹ لے کر وہ دفینہ اس کے ورثا کے حوالے کر دیتے ہیں، یا سانپوں کی آنکھوں میں وہ سحر ہوتا ہے، جس سے وہ آدمی کو بے بس کر دیتا ہے۔ اژدہا دور ہی سے اپنی سانس کے ذریعے اپنے شکار کو کھینچ لیتا ہے۔ سانپ اپنا بدلہ لیتا ہے۔ یا سانپ کی آنکھوں میں اپنے قاتل کی تصویر آجاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ صرف قصے کہانیوں کی باتیں ہیں، حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

زہریلی نسل کے سانپوں میں سب سے زیادہ زہریلے چار قسم کے سانپ ہوتے ہیں۔ ناگ (کوبرا) کریٹ، دھوڑس (رسل وائپر) اور افعی (سواسکیل وائپر)۔ سانپ کے بولنے کے اعضا نہیں ہوتے یہ صرف اپنی ناک سے ہی سسکاری بھرتے ہیں۔ سانپ کی آنکھوں پر پلکیں بھی نہیں ہوتی ہیں۔ ان کی آنکھوں پر ایک شفاف جھلی چڑھی ہوتی ہے جس کی مدد سے وہ دیکھ بھی سکتے ہیں۔ سانپ کی زبان اسے ذائقے کے علاوہ بو کا بھی احساس کراتی ہے۔

سانپ اپنے شکار کو ٹکڑے کر کے نہیں کھاتا بلکہ پورا کا پورا نگل لیتا ہے۔ سانپوں کے جبڑے بڑے لچیلے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے یہ اپنے جسم سے بڑے جانور کو بھی نگل جاتے ہیں۔ پیٹ میں موجود بہت تیز قسم کے تیزاب پورے شکار کو آسانی سے ہضم کرا دیتے ہیں۔

سانپ کے زہر میں مختلف زہریلے مادے (ایزائم) پائے جاتے ہیں۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سانپ کے زہر کا رنگ نیلا ہوتا ہے جو بالکل غلط ہے۔ سانپ کا زہر سنہری پیلے رنگ کا ایک رقیق ہوتا ہے۔ اس میں نہ کوئی بو ہوتی ہے اور نہ ذائقہ۔ بین الاقوامی ادارۂ صحت کی رپورٹ کے مطابق پوری دنیا میں ہر سال سانپ کے کاٹے ہوئے لوگوں میں سے 30 سے 40 فیصد لوگ مر جاتے ہیں۔ ان مرنے والوں سے 7000 سے 12000 ہزار آدمی ہندوستانی ہوتے ہیں۔ مرنے والے زیادہ تر لوگ زہر کی بجائے خوف اور دہشت سے مرتے ہیں۔

سانپ کے زہر سے مختلف قسم کی دوائیں تیار کی جاتی ہیں جو کہ مختلف انسانی بیماریوں میں کام آتی ہیں۔ خاص طور سے گٹھیا اور درد کے علاج میں یہ دوائیں تیر بہدف ثابت ہوتی ہیں۔ □□□

پتہ:
K-52, Batla House, Okhla, New Delhi-25

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

قدیم ہندوستان کی ثقافت و تہذیب تاریخی پس منظر میں

مصنف: ڈی. ڈی. کوسمبی

مترجم: بالمکند عرش ملسیانی

ہندوستان کی تہذیب وثقافت دنیا کی چند قدیم تہذیبوں اور ثقافتوں میں سے ایک ہے۔ مشہور مورخ ڈی. ڈی. کوسمبی نے اس کتاب میں ہندوستانی تہذیب وثقافت کے سرچشموں کی نشاندہی کے علاوہ اس کی بالیدگی وترقی کا تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔ ماقبل تاریخ عہد کی ثقافت، آریوں کی آمد اور مگدھ سلطنت کو خصوصیت سے موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

صفحات:319، قیمت-/73روپے

شیر شاہ اور اس کا عہد

مصنف: کالکارنجن قانون گو

مترجم: رام آشرے شرما

شیر شاہ دنیا کی ان بڑی ہستیوں میں سے ایک ہے جن کے ساتھ تاریخ نے انصاف نہیں کیا ہے۔ اس کی سب سے اہم وجہ غالباً یہ رہی کہ شیر شاہ کی وفات کے دس سال کے اندر اس کا خاندان نیست و نابود ہو گیا اور زمام اقتدار پھر مغلوں کے ہاتھ میں آ گئی جنہیں شیر شاہ سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ اس کتاب میں فارسی زبان کے جملہ دستیاب ماخذ اور دیگر ذرائع کی مدد سے حقائق تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

صفحات:704، قیمت-/135 روپے

تاریخ جہانگیر

مصنف: ڈاکٹر بینی پرشاد

مترجم: رحم علی الہاشمی

مغلیہ سلطنت کے چوتھے فرماں روا جہانگیر کے بارے میں لکھی گئی زیادہ تر کتابوں میں مغربی مورخین کی آرا سے استفادہ کیا گیا ہے جن کی صحت پر شک کی کافی گنجائشیں ہیں۔ اس کتاب میں پہلی مرتبہ تزک جہانگیری، اقبال نامہ اور دیگر فارسی تاریخوں، معاصر یورپیوں کے سفر ناموں اور خطوط کی مدد سے جہانگیر کے عہد حکومت کے تمام اہم سیاسی اور فوجی کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

صفحات:365، قیمت-/90روپے

تاریخ شاہجہاں

مصنف: ڈاکٹر بناری پرشاد سکسینہ

مترجم: ڈاکٹر سید اعجاز حسین

شاہجہاں کا عہد حکومت ہندوستانی تاریخ کا ایک زریں باب سمجھا جاتا ہے۔ اس عہد میں ہر طرف امن چین اور خوش حالی تھی اور ہر طرف علم وہنر کی ترقی نظر آتی تھی۔ اسی عہد میں تاج محل، لال قلعہ اور جامع مسجد جیسے ہند مغل فن تعمیر کے بہترین نمونے بھی وجود میں آئے اور بڑے بڑے جنگی معرکے بھی سر ہوئے لیکن اسی عہد میں عظیم مغلیہ سلطنت کے زوال کے آثار بھی نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر بناری پرشاد سکسینہ نے ان تمام حقائق کا معروضی جائزہ پیش کیا ہے۔

صفحات:446، قیمت-/109 روپے

جنوبی ہند کی تاریخ

مصنف: کے. ایل. نیل کنٹھ شاستری

مترجم: آر. کے. بھٹناگر

اس کتاب میں جنوبی ہندوستان کی قدیم تاریخ سے سترھویں صدی کے نصف تک کی مدت کا جائزہ پیش کیا گیا ہے جس میں جنوبی ہند کے جغرافیائی حالات، آریوں کا عروج، موریہ سلطنت، ستواہن، بہمنی اور دوسرے نگر سلطنتیں اور ان کا ادب، آرٹ، مذہب اور فلسفہ وغیرہ زیر بحث آئے ہیں۔

صفحات:، 567، قیمت-/114 روپے

علی وردی اور اس کا عہد

مصنف: کالی کنکر دتا

مترجم: عبدالاحد خاں خلیل

جب مغلیہ سلطنت کی بنیادیں کمزور ہو گئیں تو ملک کے مختلف خطوں میں خودمختار حکومتیں وجود میں آنے لگیں۔ بنگال میں علی وردی خاں نے 1740 میں اپنی حکومت قائم کی۔ اس کتاب میں علی وردی کے حالات زندگی، بنگال، بہار اور اڑیسہ پر اس کا قبضہ، مرہٹوں کے حملے، افغانوں کی بغاوت اور دیگر اہم واقعات کے ساتھ ساتھ اس عہد کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی صورت حال پر بنیادی ماخذ کی مدد سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات:392، قیمت-/86روپے

انقلاب 1857

مرتب: پی. سی. جوشی

انقلاب 1857 ہندوستانی تاریخ کا ایک ایسا غیر معمولی واقعہ ہے جس کے ملک اور قوم پر دوررس اثرات مرتسم ہوئے۔ یہ انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کے لیے پہلی قومی بغاوت تھی جس نے ملکی سطح پر یکجہتی کے جذبات کو ابھارا۔ اس کتاب میں مختلف شعبۂ حیات پر اس کے اثرات پر ہندوستانی مورخین اور ادیبوں کے علاوہ غیر ملکی قلم کاروں کے بھی چند مقالات شامل کیے گئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس انقلاب کا بین الاقوامی سطح پر بھی غیر معمولی نوٹس لیا گیا۔

صفحات:359، قیمت-/75روپے

انقلاب فرانس

مصنف: جے. ایم. تھامپسن

مترجم: بی. جے. سنگھ

1789 کا انقلاب فرانس تاریخ عالم کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے جس نے تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ آنے والے دنوں میں اس نے دنیا کی دیگر اقوام کو ظلم اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے اور ظالم حکومتوں کا تختہ پلٹ دینے کا عزم وحوصلہ عطا کیا۔ اس کتاب میں اس عظیم انقلاب اور اس کے اثرات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات:758، قیمت-/140 روپے

RNI No. 70323
DL-SW-15/4104/2008
Date of Publication : 24/03/2008

URDU DUNIYA Monthly, April 2008, Vol. 10, Issue: 4
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

جامع التذکرہ (جلد اول)

مؤلف: پروفیسر محمد انصار اللہ

شعرائے اردو کے تذکرے نہ صرف شعرا کے احوال و کوائف سے متعارف کراتے ہیں بلکہ ان میں شامل انتخاب کلام سے ان شعرا کی درجہ بندی اور ان کی ادبی قدر و قیمت پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ یہ تذکرے اردو تنقید کا اولیں نقش بھی ہیں۔ پروفیسر محمد انصار اللہ نے بڑی محنت سے اردو اور فارسی تذکروں میں شامل مختلف شعرا سے متعلق مواد کو حروف تہجی کے اعتبار سے یکجا کر دیا ہے۔

صفحات: 384، قیمت: -/140 روپے

بحر الفصاحت (دو جلدوں میں)

مصنف: حکیم نجم الغنی خاں نجمی رام پوری

تدوین: ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

"بحر الفصاحت" نظم و نثر کے محاسن اور معائب پر ایک اہم کتاب ہے جو اپنے موضوع پر استناد کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1885 میں رام پور کے مطبع سرور قیصری سے اور دوسری اور تیسری بار مطبع منشی نولکشور لکھنؤ سے بالترتیب 1917 اور 1926 میں شائع ہوئی۔ یہ ایڈیشن 1926 کے ایڈیشن پر مبنی ہے۔

صفحات: 1621، قیمت: -/730 روپے

پریم چند کا تنقیدی مطالعہ

مصنف: ڈاکٹر قمر رئیس

پریم چند اردو کے ایک بڑے ناول نگار ہیں۔ اس کتاب میں پروفیسر قمر رئیس نے ان کی زندگی، ان کے تصور حیات، ان کے عہد اور ان کی تخلیقات کا مطالعہ اس خوش اسلوبی سے کیا ہے کہ یہ کتاب حوالے کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ پہلی بار یہ کتاب دسمبر 1959 میں شائع ہوئی تھی۔ قومی اردو کونسل نے اس کا تازہ ایڈیشن شائع کیا ہے۔

صفحات: 424، قیمت 1-/52 روپے

کلیات سعادت حسن منٹو (پہلی جلد)

مرتب: پروفیسر شمس الحق عثمانی

سعادت حسن منٹو بیسویں صدی کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اردو ادیبوں میں سے ہیں۔ کونسل نے ایک بڑے منصوبے کے تحت ان کی تمام تحریریں جن میں افسانے، ریڈیو ڈرامے، فیچر، مضامین، خاکے وغیرہ شامل ہیں، شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پہلی جلد میں "آتش پارے"، "منٹو کے افسانے" اور "دھواں" کے افسانے شامل ہیں۔ ساتھ میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔

صفحات: 565، قیمت: -/285 روپے

کلیات علی سردار جعفری

مرتب: علی احمد فاطمی

قومی اردو کونسل نے قدیم اور جدید عہد کی اہم اردو تصانیف کو زمانے کی دستبرد سے محفوظ رکھنے اور اس قیمتی علمی و ادبی سرمائے کو موجودہ اور آنے والی نسلوں تک پہنچانے کے لیے ایک منضبط منصوبے کے تحت ان کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ "کلیات علی سردار جعفری" اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس کی پہلی جلد میں "پرواز"، "نئی دنیا کو سلام"، "خون کی لکیر" اور "امن کا ستارہ" اور دوسری جلد میں "ایشیا جاگ اٹھا"، "پتھر کی دیوار"، "ایک خواب اور"، "پیراہن شرر"، "لہو پکارتا ہے" اور بعد کی چند نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔

جلد اول صفحات: 496، قیمت -/164 روپے، جلد دوم: صفحات: 533، قیمت -/200 روپے

کلیات حسن نعیم

مرتب: احمد کفیل

نئی غزل کے پیش رووں میں حسن نعیم کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کی شاعری میں جو بانکپن نظر آتا ہے وہ اردو کی غزلیہ روایت میں انفرادیت کا حامل ہے۔ "کلیات حسن نعیم" میں ان کی تمام شعری تخلیقات تاریخی ترتیب سے جمع کر دی گئی ہیں۔

صفحات: 335، قیمت: -/185 روپے

کوشش (منظر نامہ)

مصنف: گلزار

اردو زبان میں فلمی منظر نامہ ایک نئی صنف ادب ہے۔ اسے بصری پیکروں کا ایک ایسا سلسلہ کہا جا سکتا ہے جو کہانی کی شکل اختیار کر لے۔ فلم "کوشش" کا یہ منظر نامہ جاپانی فلم "ہیپی نیس آف اس الون" پر مبنی ہے جس میں ایک گونگے بہرے لڑکے اور ایک گونگی بہری لڑکی کی کہانی بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 84، قیمت: -/48 روپے

میرے اپنے (منظر نامہ)

مصنف: گلزار

قومی اردو کونسل نے فلمی منظر ناموں کی اشاعت خاص طور سے ان طلبہ اور طالبات کی رہنمائی کے لیے شروع کی ہے جو فلمی شعبے میں اپنا کیریئر بنانے کے خواہش مند ہیں۔ منظر نامہ "میرے اپنے" مشہور فلم ساز تپن سنہا کی بنگالی فلم "اپن جن" کی کہانی پر مبنی ہے۔

صفحات: 139، قیمت: -/63 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

Printed and Published by Dr. Ali Javed, Director, NCPUL on behalf of NCPUL and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published at NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, Editor : Dr. Ali Javed, Tel : 26103381, 26103938